

نیاز فتحپوری

قواعد رسالہ نگار

۱ ـ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ ـ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا

۳ ـ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین

۴ ـ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ ـ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین ـ

۶ ـ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ، ششماہی تین روپیہ ـ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ـ

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

جلد ۱۴ - شمارہ ۱

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ ر

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۱	جولائی سنہ ۱۹۲۸ء	جلد ۱۴

ملاحظات

اس مہینہ کی اشاعت سے چودہویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جسوقت اپنی بے سروسامانی، کم مایگی، اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جسنے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور نگار کو اس منزل تک پہونچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قاید کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ سچ ہے

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

میں نگار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اسوقت نظر آ رہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و موانع کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوا کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کر رہجاے تو اک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

بر ہمیں یک آرزو بربستہ ام تعمیر دل

بہرحال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم رکھتے ہوئے کہہ سکونگا کہ

شگفتن گل اُمید را تماشہ کن

سنگین بت کے سامنے سرعجز خم کر دینا، آفتاب کو دیکھکر اُس کے سامنے جھک جانا، آگ کے حضور میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا، حرم کا طواف، سنگ اسود کا استلام، ان میں سے کوئی بات داخل شرک نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدائی طاقت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ ذرائع ہیں خیال میں مرکزیت اور تصور میں استنداد پیدا کرنے کے۔ شرک فی الحقیقت نام ہے انسان کے پوجنے کا انسان کو، سر نیاز جھکا دینے کا اُس تقدم شخصی کے سامنے جو دوسرے انسان سے اس کی خصوصیات انسانی تو چھین سکتا ہے لیکن عطا کچھ نہیں کرتا، پھر غور کرو کہ آج کتنے ہیں جو اس شرک عظیم میں مبتلا ہیں اور ہر جماعت نے انسانیت کی کتنی عظیم الشان قربانیوں کے بعد اپنے بت علحدہ بنا رکھے ہیں میں عام معتقدات کے خلاف عیسیٰ کی تخلیق و ممات کو ایک معمولی انسان کی سی تخلیق و ممات کہتا ہوں، لیکن کسی زیدی جبینی کے جوش ایمان میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، میں یوسف کے غیر معمولی حُسن و جمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زادہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں بہشت و دوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح و ترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلاف مُومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جاسکتا مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، درسگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خون زکفن بر چکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیسا عجیب و غریب منظر ہے!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تہی مایگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اس لئے کہ اس کو ناکارہ ماننے کے بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبحیات کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت ظرف و نظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ و تاریخ، روایت و درایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف واقعات کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اُنھوں نے اپنے پورے قصد و ارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی و اذعانی ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اُٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب و نقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ انہیں

کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں ! ۔

برتمنا ہائے عرفی خندہ می آید مرا

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہر چند گمنام کا ہے لیکن ہے کام کا۔ جناب ذوقی کا فسانہ "عید کی چاندرات" فن کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حقیقیات نگاری کہتے ہیں۔ تجربات و جذبات کا دقیق تجزیہ اور بیان کا وہ اسلوب جو پڑھنے والے کے سامنے تمام کیفیات و مناظر کو پیش کر دے آسان کام نہیں، لیکن مجھے مسرت ہے کہ لکھنے والے نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ قدرتاً ممثل پیدا ہوئے ہیں۔

مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن پر جناب احسن لکھنوی کا مضمون نہایت کارآمد ہے۔ کاش زیادہ بسیط ہوتا۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندی ادب کے مطالعہ پر جناب راج بہادر صاحب ایم اے کا مقالہ خوب ہے۔ یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور ادبی لٹریچر کا مطالعہ کرے جس طرح ایک ہندو کا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے لٹریچر کو دیکھے ۔

سیاحت قمر اس مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئی جسکا مجھے افسوس ہے۔ آئندہ ماہ میں اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے ۔

جناب مجنوں گورکھپوری کا فسانہ بہت دنوں کے بعد شائع ہو رہا ہے لیکن "درست آید" کا پورا مصداق ہے۔ مجنوں نے جس لطف و حُسن کے ساتھ ٹامس ہارڈی کے فلسفۂ "بندگی و بیچارگی" کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ حد درجہ وقت احساس و نزاکت تاثر بھی ثابت ہوتی ہے۔ یہ فسانہ ستمبر میں ختم ہوگا۔

باب الاستفسار میں معاد کے متعلق میں نے اپنے خیالات کسی نہ کسی طرح سمیٹ کر اس مرتبہ ختم کر دئے ہیں۔ اگر مولوی غلام ربانی عزیز کو اب بھی کچھ شبہات ہوں تو وہ خط و کتابت کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں۔

فلسفۂ مذہب میں اس مرتبہ بعض خیالات جناب سید مقبول احمد صاحب نے ایسے ظاہر کئے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے ارادہ ہے کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس پر ایک محاکمہ کروں۔

روش صدیقی کی نظم فردوس محبت بہت پاکیزہ و رنگین ہے۔ غزلوں میں حافظ غازیپوری کے اکثر اشعار اور بعض بعض جگر، اثر، ناطق اور باسط کی بھی خوب ہیں ۔

عشرت حسین صاحب نقوی صاحبزادۂ سید جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم لکھنؤ نے ایک رسالہ کیمیا کے نام سے بڑی تقطیع پر یہاں سے جاری کیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ مضامین کے فراہمی اور ان کی ترتیب و تنوع میں کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے اسوقت ملک کو ایسے رسالوں کی جو ہمارے اندر صنعت، حرفت و تجارت کا ذوق پیدا کریں اور صحیح مشورہ دیکیں سخت ضرورت ہے، ہمیں اُمید ہے کہ جناب جالب ایسے تجربہ کار صحافی کی نگرانی میں یہ رسالہ بہت مفید خدمت ملک کی انجام دیگا۔ منیجر رسالہ کیمیا لکھنؤ سے نمونہ طلب کیا جا سکتا ہے ۔

نیاز

حیات قومی کے اجزاء ترکیبی

اور

ہیئت اجتماعی کے اصول اساسی

تمہید جو چیز انسان کو کرۂ ارض کی اور تمام مخلوقات سے جدا و ممیز کرتی ہے، وہ اس کا ضرورت سے زیادہ محتاج و بیکس ہونا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ جو مخلوق اپنی فطرت و خلقت کے اعتبار سے اس درجہ ضعیف، اس قدر حقیر اور اس حد تک کمزور ہے اسی کو اشرف مخلوقات اور غایت تخلیق بتایا جاتا ہے!

یقیناً یہ نہایت عجیب بات ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ ایک طرف اس کی بیکسی و بیچارگی کا منظر تو یہ ہے کہ جس وقت وہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک ایسی لایعنی شے ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک حادثۂ طبعی دم زدن میں اسکو فنا کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں اتنی بھی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ادنیٰ سی حرکت اپنے تحفظ یا بقا کے لئے کر سکے برخلاف حیوانات و نباتات کے کہ شروع ہی سے ان کو اپنے بقا کے لئے اپنے اوپر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور عطایائے قدرت سے فائدہ اٹھانے کی ان میں اہلیت ہوتی ہے۔

پھر اسی انسان کی قوت و جبروت کا دوسرا منظر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف وہی حیوانات، نباتات، جمادات جو ابتدا میں اس سے زیادہ مستقل و برتر نظر آتے تھے، اسکے زیر اقتدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام فضا میں اس کی حکومت نظر آتی ہے اور نوامیس فطرت سے وہ اس طرح کام لینے لگتا ہے گویا ابد و ازل کا وجود اسی سے عبارت ہے

بہر حال یہ مناظر اس قدر عام ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی طویل بیان کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کی، لیکن اس سے کیا درس اخلاق پیدا ہوتا ہے؟ یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

انسان کی تخلیقی بیچارگی اور ارتقائی عظمت کا تقابل ہم کو بتاتا ہے کہ گو وہ پیدا ہوتا ہے تنہا ہی، لیکن اس کی انفرادیت ایک ایسی ناقابل توجہ چیز ہے جس کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کی خلقی کمزوری ہی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ محتاج ہے نظام تمدن کا، ہیئت اجتماعی کا۔ تعاون باہمی کا اور ہر اس بات کا جو ایک کو دو، دو کو چار اور چار کو آٹھ بناتی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک انسان انفرادی حیثیت سے جن خصوصیات کا مالک ہوگا، وہی خصوصیات ہیئت اجتماعی کو بھی حاصل ہونگی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "بچہ انسان کا باپ ہے اور ایک" انسان مستقل قوم ہے"۔ اگر ایک بچہ کی تربیت خراب ہو رہی ہے تو اسکے یہ معنے ہیں کہ قوم کی ترکیب میں ایک داغدار و معیوب عنصر شامل کیا جا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف ایک فرد کی خرابی سے

قوم کو کسی وقت کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، کیونکہ کسی ایک فرد کی خرابی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک ایسا سلسلہ خرابیوں کا پیدا ہو جاتا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوتا اگر آپ نے کبھی تالاب کے پانی میں کنارے کی طرف ایک کنکری پھینکی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ اس سے لہریں پیدا ہو کر کس طرح انکا سلسلہ دوسرے ساحل تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی صرف ایک اینٹ کی خرابی سے ساری عمارت کا گر جانا بھی آپ نے سنا ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کا نقصان محدود ہو اور صرف ایک ہی شخص کو اس سے نقصان پہونچتا ہو۔ اسی طرح دنیا کا کوئی اچھا فعل ایسا نہیں ہے جس سے جماعت کی جماعت فایدہ نہ اٹھاتی ہو

چنگیز خاں ایک ہی شخص تھا لیکن اس کے نقصانات کے بارے دنیا چیخ اٹھی اور مسیح و محمد کا وجود بھی ایک ہی ——— تھا لیکن دنیا میں امن کا تخم انھیں کی وجہ سے بار آور ہوا۔ صرف ایک نیرو نے رومہ کی تباہی میں جتنا حصہ لیا کسی سے مخفی نہیں اور ایک مارکونی اور ایک اڈیسن کی ذات نے جو راہیں ترقی کی انسان کے لئے کھولدیں، وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ بہر حال فرد کی اصلاح خاندان کی اصلاح ہے۔ اور خاندان کی اصلاح قوم کی اصلاح ہے اور قوم کی اصلاح ملک کی فلاح ہے۔

جس طرح ایک درخت عبارت ہے تنہ، شاخ، پتی، پھول اور پھل سے اسی طرح ہیئت اجتماعی مرکب ہے مختلف افراد سے جنکی خدمت شاخ، پتی وغیرہ کی طرح بالکل علٰحدہ علٰحدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے ہر ایک شخص کی علٰحدہ علٰحدہ انفرادی حیثیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور من حیثیت المجموع اس کا تعلق بھی ہیئت اجتماعی سے ثابت ہوتا ہے الغرض فرد اور جماعت کے درمیان ایسا مضبوط تعلق، اتنا شدید ارتباط ہے کہ علمی طریقہ سے ایک کا بغیر دوسرے کے پایا جانا ناممکن ہے۔ آدم کے لئے حوا کا پیدا کیا جانا حقیقتاً استعارہ ہے اس رمز کی طرف اور تعلیم ہے اسی تعاون و اجتماع کی۔

تعاون سے مراد کیا ہے؟ مختلف افراد انسانی میں اعمال کی تقسیم ہر عمل کے طریق کار کی تعیین اور کسی غایت یا غرض مشترک کا وجود جس کے حصول کے لئے افراد تعاون سے کام لیں۔

یہ دونوں اساسی اصول ایسے ہیں کہ نہ صرف جماعت انسانی بلکہ عالم حیوانی میں بھی ان کا وجود پایا جاتا ہے اور خود مختلف اعضاء حیوانی کی ساخت اس امر کی شاہد ہے کہ فطرت بھی انہیں اصول کی کاربند ہے۔ اور اسپر غور کرنے سے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا تنہا مالک نہیں ہے بلکہ ساری قوم اُس کی مالک ہے اور اس طرح نہ اپنے نتیجۂ عقل و عمل سے وہ تنہا فایدہ اُٹھا سکتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بناپر خودکشی کا اقدام قانونی جرم قرار دیا گیا اور اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے۔

انسان جو اس وقت تمام عالم پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اُس کا سبب سوائے قوت عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور اعمال ہی کی تفریق سے مدارج انسانی متعین کئے جاتے ہیں۔ پھر جب ہم اسباب عمل پر غور کرتے ہیں تو اس کی محرک تین چیزیں نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز تو اس کی طبعی و فطری قوت ہے جس میں بچہ، جوان، دیوانہ، عاقل، عالم و جاہل سب برابر کے شریک ہیں اس کو گویا موٹر یا انجن سمجھنا چاہئے، دوسری چیز جلب منفعت ہے اور تیسری ادائے فرض۔ یہ دونوں اگر زیادہ وسعت نظر اور بلند خیالی

کے ساتھ کام میں لائے جائیں تو تعاون کی وہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مقصود آفرینش ہے اور جو ایک قوم و ملک کی ترقی کی ضامن ہیں

اگر آج ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ صرف اپنی زندگی آرام سے بسر کر لیجائیں، تو اس کو نہ صرف خود غرضی کہیں گے بلکہ غیر فطری بھی اور ایک انسان کا بہ حیثیت انسان ہونے کے سب سے زیادہ ذلیل جذبہ یہی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو تجرد کی اور راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا وجود قوم کے لئے مادۂ فاسد کا حکم رکھتا ہے جس کو جلد سے جلد نکل جانا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے ساتھ اپنے متعلقین یا بیوی بچوں کی راحت و آسائش کا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے، ہر چند یہ قسم اول کے انسان سے بہتر ہیں، لیکن غایت آفرینش ان سے بھی پوری نہیں ہو سکتی، ایسے لوگ صرف اس حد تک کہ ان کے عائلہ کا تعلق ہے بہت اچھے، وسیع النظر، ایثار پسند ہوتے ہیں، لیکن گھر کی چار دیواری سے باہر وہ ساری دنیا کے لئے خود غرض سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بلند مرتبہ والے انسان ہیں جو اپنی ذات، اپنی اغراض کو اپنی قوم کی فلاح کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ان کے ہر فعل و عمل کا نصب العین قوم کی خدمت ہوتی ہے، لیکن ایک درجہ اس سے بھی بلند ہے اور یہ کہ قوم و ملک کی تخصیص بھی باقی نہ رہے اور تمام ابنائے جنس بلکہ اس سے بھی زیادہ سارا عالم حیات پیش نظر رہے۔ یہ مرتبہ سوائے انبیا و رسُل کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

بہرحال انسانی تفوق و برتری کے مدارج اس کے حسن ظاہری کے لحاظ سے قائم نہیں ہوتے بلکہ حسن فطرت کے اعتبار سے اُن کی تعیُن ہوتی ہے اور ایک صحیح تعلیم و تربیت کا مقصود یہی ہونا چاہیئے۔

نٹشے کی یہ تعلیم کہ "قوی، کمزور کو جذب کر لیتا ہے، فنا کر دیتا ہے" ممکن ہے بہ لحاظ واقعات صحیح ہو، لیکن بہ لحاظ اخلاق نہایت مہلک قسم کی تعلیم ہے۔ یقیناً اس نے یہ نظریہ ڈارون کے اصول "تنازع للبقا" سے اخذ کیا ہے لیکن سخت غلط فہمی کے ساتھ۔ ہر چیز اپنی بقا و قیام کے لئے کوشش کرتی ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، قوی و ضعیف کے تصادم میں اکثر و بیشتر ضعیف ہلاک ہو جاتا ہے یہ بھی درست ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قوی کو ضعیف کے ہلاک کر دینے کا فطری حق حاصل ہو، کیا وجہ ہے کہ قوی اپنے ضعیف ابنائے قوم کے سنبھالنے اور ہلاکت سے بچانے کی تدبیر نہ کرے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصول تعلیم و تربیت نہایت مستحکم و صحیح ہوں، ہمارے ہاں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک مقصود تو تکمیل فنون ہوتا ہے اور دوسرا صحت اخلاق اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان دونوں میں کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ان دونوں کا اجتماع کہ اس میں مغرب بھی ہنوز کامیاب نہیں ہوا۔

بچہ کی تعلیم و تربیت کی اولین جگہ ماں کی گود ہے، یہ تمام اقوام عالم کا مسلمہ مسئلہ ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دنیا بچوں کی تعلیم کا تو درس دیتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں جو بچہ کی اولین درسگاہ ہے۔

اس وقت تعلیمی مسئلہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے اور اسی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بحالت موجودہ جو مدارس یا کالج ان کے پائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط اصول پر قائم ہیں اور ان کی تعلیم بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو اچھ[illegible]

ماں بننے کا اہل بنائے، سرے سے ماں ہی نہیں بنانا چاہتی۔ اس میں شک نہیں کہ ان مدارس میں لڑکیوں کو خوبصورت معاشرت کا درس ضرور دیا جاتا ہے اُن کو یقیناً وہ ادائیں بتا دی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے شباب میں ایک ساحرانہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی کے ساتھ اُن کو ظاہری نمود و آرائش کے بھی تمام طریقے سکھا دئے جاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کو ماں بننے سے کیا واسطہ ہے اور اخلاق کا تعلق اُن سے کس حد تک ہے۔

موجودہ تعلیم لڑکیوں کو خوشنما ضرور بناتی ہے، لیکن نہ خوشنما ہونا اچھا ہونا ہے اور نہ حسین بننا مفید بننا۔ پھر جب ہر حسین چیز مفید نہیں تو کلیہ قائم کرنے کی غرض سے اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ حسین وہی ہے جو اچھا اور مفید ہو۔

انگریزی تعلیم، لڑکیوں کے لئے ہر چند بُری نہ ہو، لیکن غیر ضروری یقیناً ہے کیونکہ جہاں تک درستی اخلاق کا تعلق ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ انگریزی تعلیم بڑی حد تک اخلاق سے بیگانہ بنا دیتی ہے

درستی اخلاق کا تعلق نہ قانون سے ہے اور نہ تخویف و تربیت سے، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق صرف مذہبی روحانیت سے ہے اور انگریزی تعلیم سے مذہبیت کو جس قدر نقصان پہونچ رہا ہے ظاہر ہے۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کن اصول پر ہونی چاہئے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہوسکتی ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ مذہب نام کسی کتاب کا نہیں، بلکہ صرف افعال و اعمال کا ہے تو سب سے پہلے ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی استانیوں کا فراہم کرنا ہے جو اپنے اوقات و مشاغل کے لحاظ سے مذہب کی پابند ہوں اور کوئی حرج نہیں اگر وہ ایک حد تک آزاد خیال ہوں ہم کو ایسی استانیوں کی ضرورت نہیں جو ریشمی ملبوس میں ملفوف ہوں، زینت و آرائش کی تصویر ہوں، لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ نہایت درشت و مکروہ نظر آئیں، ستھراپن اور صفائی نام نہ خوش ادائی کا ہے، نہ لباس کی اچھی تراش خراش کا اور نہ ٹیڑھی مانگ اور بانکے جوڑے کا، بلکہ اس سے مراد ہے وہ پاکیزگی نفس جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو پسندیدہ بنا دیتی ہے۔

مثال کے طور پر آپ ایک نہایت معمولی سی بات کو لے لیجئے کہ وہ عورتیں جو نماز کی پابند ہیں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں اور یہ عادت ان میں چونکہ مذہبی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اس قدر مستحکم و پائدار ہوتی ہے کہ معمولی اصول معاشرت کے ذریعہ سے استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسی کے ساتھ جب ان کی رفتار و گفتار پر نظر جاتی ہے تو وہاں بھی روحانی خلوص نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کئے لیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ایک بچہ کے دل میں نقش کرنی چاہئے وہ خدا کا خوف اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و راحت کا جذبہ ہے اور یہی دو چیزیں اخلاقیات کی جان ہیں، لیکن کیا موجودہ انگریزی مدارس میں اس تعلیم کی توقع کی جاتی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں وہاں ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنے میں خدا کی طرف توجہ کیجاتی ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں اور مدارس کی تعلیم اس درجہ ناقص ہے تو سوائے اسکے کہ کوئی چارہ نہیں کہ لڑکیوں کو مدارس بھیجنے سے باز رکھا جائے اور خود گھر پر انکی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کے لئے جو نصاب میں نے تجویز کیا ہے وہ عام ارتقاء ذہنی کے لحاظ سے باوجود غیر انگریزی ہونے کے اسی حد تک مکمل ہے اور بہ لحاظ اخلاقی تعلیم کے تو خیر اس کو بلند ہونا ہی چاہئے کیونکہ اس کی بنیاد بالکل مذہب پر قائم کی گئی ہے۔*

* میں اس پر آئندہ تفصیل کے ساتھ بحث کروں گا اور پھر اسکے بعد بتاؤں گا کہ لڑکیوں کی موجودہ تعلیم میں کیا کیا نقائص ہیں اور ان کے علاوہ کون سے دوسرے مضامین کا اضافہ کرنا چاہئے۔ ن

عید کی چاندرات

(فسانہ)

تانگہ نہایت تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور چمڑے کا چھوٹا بکس جسے اسٹیشن پر جلدی کی وجہ سے میں نے تانگہ کے اندر بے ڈھنگے پن سے الٹا سیدھا رکھوا دیا تھا، پاؤں کے قریب تانگہ کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں اور مکانات سرعت کے ساتھ پیچھے سرکتے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں بازار کی کسی چیز کو اچھی طرح نگاہیں جما کر دیکھوں۔ صرف ایک خیال، ایک نشہ میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی اور بھیڑ کے ساتھ سودے والوں کی پکار، دوکانداروں کی آوازیں، راہ گیروں کی صدائیں سبھی کچھ شامل تھا۔ لیکن جس طرح ایک شرابی کو اپنی ترنگ میں گرد وپیش کی تمام چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح بازار کا تمام منظر میری نظروں میں ایک بے رنگ دھندلا سا خاکہ تھا جو جلدی جلدی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجمع کی چیخ پکار بھی میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور ہو جاتی تھی جیسے کچی نیند میں کوئی شخص بہت دور کی آوازیں سن رہا ہو۔ بازار کے اس بے معنی ملے جلے شور میں صرف تانگے والے کی "ہٹو بچو" البتہ صاف سنائی دیتی تھی ورنہ اُس کے علاوہ مجمع کا تمام شور وغل میرے کانوں کے لئے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اسٹیشن سے مکان تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی اتنا البتہ یاد ہے کہ جب تانگہ ایک مقام پر جھٹکے کے ساتھ رک گیا تو میرے سامنے وہ گلی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ ایک جست کے ساتھ تانگہ سے کود پڑا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا لیا کمبل کو کاندھے پر ڈالا اور تانگے والے کو جلدی سے کرایہ دیتے ہوئے میں نے گلی کا رخ کیا۔

گلی کے موڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین چاروں طرف اپنی زرد مدھم روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں بے صبری کے لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ میری رفتار کے ساتھ گلی کی دیوار پر میرے قدم کا سایہ بڑا ہوتا جاتا تھا اور میں اپنے قدموں میں ایسی پستی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم کی رگوں میں پارہ بھر دیا ہو۔ گلی کے مکانوں میں بات چیت اور قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض کے دروازے بند تھے اور بعض کے ادھ کھلے دروازوں میں سے اندر کی روشنی نکل نکل کر گلی کی روشنی میں تحلیل ہو جاتی تھی آج اس محلے میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ دومنزلہ مکانوں کی کھڑکیاں عموماً کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے حقے کی گڑگڑاہٹ اور برتنوں کی کھڑبڑ کی آوازوں میں شوخ و شریر بچوں کی چیخ پکار کی صدائیں آ رہی تھیں۔ آج رمضان کی آخری تاریخ تھی اور یہ تمام رونق و چہل پہل اس پرمسرت مبارک دن کا پیش خیمہ تھی جو سال بھر کی طول طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتا ہے

محلے والوں کی یہ پُر انبساط مصروفیت اور بچوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں میرے لئے اسوقت خاص طور پر بہت پرمعنی تھیں

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس گلی کی در و دیوار تک کو خبر ہے کہ میں آج کیوں اس قدر خوش ہوں۔ مجھے گرد وپیش کی تمام فضا اپنے مسرور خیالات میں غرق نظر آتی تھی۔ میرے دلی جذبات اس وقت کیا تھے؟ تفصیل بالکل فضول ہے، اور ممکن ہے تفصیل سے اُن کی لطافت بھی ضائع ہو جائے۔ بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ میری رگ رگ میں مسرت وشادمانی کا وہ نقشہ چھایا ہوا تھا جو ایک ہندوستانی نوجوان کو نئی نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں عید کرنے کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا امتحان قریب تھا اس لئے اپنی پڑھائی کا ہرج کر کے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر کر کے اس کے پاس پہنچنا کافی خطرناک جراءت تھی۔ لیکن دھن ہی کیا جس کے سرانجام میں خطرے سے مقابلہ نہ کرنا پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ محض نقصان ہی کے خیال نے اس ملاقات کی مسرتوں کو وہ لذت آفریں بنا رکھا تھا

خدا خدا کر کے یہ مسافت بھی طے ہوئی اور میرے خسر کا مکان آ گیا۔ میں دبے پاؤں مردانہ مکان میں داخل ہوا اور سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے شیروانی کی جیب میں سے رومال نکالا۔ توقع کے خلاف آج دیوان خانہ میں بالکل سناٹا تھا میرا خیال تھا کہ جس وقت میں یہاں پہنچوں گا حسب معمول میرے خسر صاحب گلوبند لپیٹے سیاہ کمانی کی عینک لگائے کمرے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہوں گے۔ وہ ایک بڑے گاؤ تکیہ سے سہارا دئے ہوئے ہوں گے، داہنی طرف ایک اونچا سا مراد آبادی گال دان، بائیں طرف تازہ ہرے پانوں سے بھرا ہوا ایک منقش خاصدان رکھا ہوگا۔ قالین پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اُن کے ادھیڑ عمر کے دوست بیٹھے ہوں گے ایک کونے پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی چند پرانی مذہبی کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔ ہوا میں حقہ کی نفیس تمباکو کی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی ہوگی اور کھانس کھانس کر اپنے دوستوں سے کسی غیر دلچسپ موضوع پر باتیں کر رہے ہوں گے۔

لیکن یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صدر کمرہ بند تھا۔ برآمدے کے درمیانی در میں لوہے کی سلاخ سے ڈیڑھ کی ایک لالٹین ٹنگی ہوئی تھی جس کی بتی نیچی تھی اور اس کی ہلکی کمزور روشنی نصف صحن تک پہنچ کر غائب ہو جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خیراتی کی کوٹھری میں بھی سناٹا تھا۔ اندر کے مکان سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی دیواروں پر ایک ناقابل بیان چپ مسلط تھی۔ البتہ باہر گلی میں کتوں کی مسلسل بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے سوچنا شروع کیا "یہ معاملہ کیا ہے؟ آج چاند رات ہے اور کل عید ہونے والی ہے۔ قاعدہ سے یہاں آج خوب چہل پہل ہونا چاہئے تھی۔ زنان خانہ سے بچوں کے لڑنے بھڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آنا چاہئے تھیں۔ ہر طرف نقل وحرکت، مشغولیت ومصروفیت کی علامات ہونا چاہئے تھے۔ مگر یہاں تو قیامت کا سناٹا ہے .... میں زنانہ مکان کی طرف بڑھا اور آواز دینے کیلئے کھنکھار کر گلا صاف کرنے لگا۔ اندر سے میرے خسر کے چھوٹے بچے کی رونے کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی انا کی لوری اور جھنجھنے کی جھنکار ایک لمحہ میں بچہ خاموش ہو گیا اور فضا میں پھر وہی اگلی سی ڈراؤنی خاموشی پھیل گئی میرا دل بیٹھنے لگا ـــــ

میں نے بہت ہمت کر کے کمزور آواز میں خادمہ کو پکارا جسے سن کر اس کا نو سال کا لڑکا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہے سنے پھر مکان میں گھس گیا اب میری گھبراہٹ اور زیادہ بڑھنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری سانس سینے میں اڑ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر میں شاید اندر میرے آنے کی اطلاع کر کے وہ اچھلتا کودتا باہر آیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر اور کمبل کاندھے پر سے گھسیٹ کر خوش خوش اندر بھاگنے لگا۔ میں نے اس کے سوکھے ہوئے زرد رنگ کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید اس غیر معمولی سناٹے کی کوئی تاویل مجھے اس کے بشرے سے حاصل ہو سکے بظاہر میرے آنے کی اسے خوشی تھی اس لئے کہ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب تک میں اس سے کوئی سوال کروں وہ "میاں اندر آئیے" کہتا ہوا چھلاوے کی طرح دروازے میں غائب ہو گیا۔

میرے قدم بھاری ہو رہے تھے اور دل میں ان تکلیف دہ خیالات کی بھیڑ تھی جو عموماً امید و بیم کی باہمی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں آرزوؤں کا ایک طوفان لئے کر اس مکان میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں کی پر اسرار خاموشی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔ لڑکے کے مسکراتے ہوئے چہرے سے البتہ کچھ ڈھارس بندھی تھی لیکن اس کا اعتبار ہی کیا آخر بچہ ہی تو ہے۔ میں نے چپکے چپکے دل میں دعا مانگنا شروع کی کہ خدا کرے اس سناٹے کی وجہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو اور مجھے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑے مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے اور ایک لمحہ میں جس میں میں نے بدقت مردانہ مکان کے صحن سے لے کر زنانخانہ کے چوکھٹ تک کا فاصلہ طے کیا میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تخیلی مناظر یکے بعد دیگرے گزر گئے ——— ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے زنانہ مکان کے سامنے والے دالان میں تخت کی صاف ستھری چاندنی پر دھانی رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے میری بیوی اپنی نازک لانبی انگلیوں سے پان بنا رہی ہے۔ دوسرے لمحہ مجھے نظر آیا کہ تمام زنانخانہ خالی پڑا ہوا ہے۔ ہر طرف سناٹے اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور مکان کے کونے کونے سے بے رونقی اور تنہائی کے آثار برس رہے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ نہیں یہ سب میری نگاہوں کا دھوکہ تھا۔ وہ کیا سامنے چبوترے پر میری خوشدامن کھڑی ہوئی کل کے انتظامات کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہیں داہنے طرف والے کمرہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کا چھریرا جسم خوبصورت لچدار کمان کی طرح ایک بڑے سے ٹرنک پر جھکا ہوا ہے ——— اور وہ اس میں سے ایک ایک کر کے عید میں پہننے کے لئے کپڑے چھانٹ رہی ہے۔ زنانخانہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ ہیولا بھی خواب کی طرح دھندھلا ہوتے ہوتے آخر غائب ہو گیا اور میں گھبرائے ہوئے قدموں سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

صدر دالان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ انا بچے کو گود میں لئے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھی گھٹنا ہلا ہلا کر اسے سلا رہی تھی۔ بازو والے دونوں کمروں میں اندھیرا پڑا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے صرف ایک بیچ والا کسیقدر کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں کھانا پکانے والی خادمہ چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں ابھی نصف صحن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کوٹھے پر سے میری خالہ کی آواز آئی۔ "میاں ادھر زینے پر چلے آؤ۔ اس طرف تمہارا سامان بھی یہیں منگوا لیا ہے۔"

میں اپنا رُخ بدل کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ محنت کچھ زیادہ سخت نہ تھی لیکن اس وقت بدحواسی کی وجہ سے میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصہ ہانپ رہا تھا اور سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔

"دس بجے والی گاڑی سے آئے ہو؟" میری خالہ نے سر سے پیر تک مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں آج گاڑی کسیقدر

دیر کرکے آئی"...... میری بے صبری ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مکان کی خاموشی دیکھ دیکھ کر میرا دم الٹا جاتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سوال کیا "آج یہاں اس قدر سناٹا کیوں ہے۔ جیسے سارا گھر خالی پڑا ہوا ہو"۔ میری خالہ بولیں۔

"تمہارے خسر حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوشدامن کا جی نہیں اچھا ہے۔ تمام بدن میں درد ہے کچھ حرارت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیچاری اوڑھے لپیٹے نیچے کمرے میں پڑی ہیں۔ بچوں نے عید کی خوشی میں اس قدر ادہم مچا رکھا تھا۔ اس قدر آفت برپا کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ! تمام صحن میں کودتے پھرتے تھے چیخ پکار سے سارے مکان کو سر پر اُٹھا لیا۔ وہ تو جب میں خوب بکی جھکی اور ایک ایک کو پکڑ کر زبردستی لٹایا ہے تب کہیں کوئی دس منٹ ہوئے سب کے سب سوئے ہیں۔ تمہاری ساس کی ماندگی کا خیال تھا۔ نہیں تو اللہ رکھے بچوں ہی کی ذات سے تو چاند رات میں چہل پہل رہتی ہے۔ نفیس بوا مغرب کی نماز ہی کے وقت سے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ اُسے عید کے لئے پان پتے کا خرچ دے آؤں"...... اور میری بیوی؟ میری بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گھر کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کا حال بتا گئیں، لیکن نہ ذکر کیا تو اسی کا جس کے لئے میں نے اُن سے یہ بات پوچھی تھی۔——

خسر دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ خوش دامن کی طبیعت خراب ہے بچے سو گئے نصیباً اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میری بیوی کہاں ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ میں نے تو گھر میں سناٹے کا سبب اسی لئے دریافت کیا تھا کہ خالہ میری بیوی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کریں گی لیکن انھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ان کا نام نہ لیا۔ تو پھر کیا وہ ابھی تک فیض آباد سے واپس نہیں آئیں؟ لیکن انھوں نے تو لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے بنارس ضرور پہنچ جائیں گی پھر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

میری شادی ہوئے ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اپنی نئی شریک زندگی کے ساتھ شادمانی اور سرشاری کے دو مختصر ہفتہ گزارنے کے بعد کالج کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اپنی بیوی کو کچھ عرصے کے لئے الوداع کہنا پڑا تھا۔ میری بیوی کو میری والدہ اپنے ساتھ فیض آباد لیتی گئیں اور میں طالبعلمانہ زندگی کی بے تکی جکڑ بندیوں کو سیکڑوں کوسنے دیتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچکر تنہائی اور جدائی کی کوفت کو دور کرنے کا تنہا ذریعہ میری بیوی کے وہ محبت بھرے خطوط ہوتے تھے جن کے ایک ایک حرف سے شریفانہ نسوانی جذبات کی مہک آتی تھی۔ میں ان کے خطوط کے لئے دیوانوں کی طرح بے چین رہا کرتا تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ڈاکئے کی وقعت میرے دل میں کسی جج سے کم نہ تھی جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے فیض آباد سے بنارس چلی جائے گی اور دبے دبے بند بند لفظوں میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں بھی عید کی تعطیل میں بنارس آجاؤں — یہی وجہ تھی کہ اس وقت آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر میرے سینہ میں ہچکولے کھا رہا تھا اور میں یہ معلوم کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا کہ میری بیوی وہاں موجود ہے یا نہیں۔ خالہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اب آخر کس طرح پوچھوں۔ ان کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا ابھی موجود نہیں جس سے کچھ پتہ چلے اور اپنی تمام آزاد مزاجی اور روشن خیالی کے باوجود مجھ میں ہرگز اتنی ہمت نہ تھی کہ میں جی کڑا کرکے خالہ سے اپنی بیوی کے متعلق کوئی سوال کروں۔ ہندوستانی معاشرت کی بے ڈھنگی پابندیوں نے میرے لبوں پر ایسی

مہر لگا دی تھی ——— جسے میری بیباک جرأت بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

"کھانا کھاؤ گے۔ یا پہلے چائے منگاؤں؟" میری خالہ نے پوچھا۔

بھاڑ میں جائے چائے، اور جہنم میں کھانا! جب وہی یہاں موجود نہیں جس کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلیں پڑھائی کا ہرج کیا تو پھر دنیا کی ساری راحتیں بیکار ہیں۔ میں یقیناً سفر کی وجہ سے بہت خستہ ہو رہا تھا اور اس تکان کو دور کرنے کے لئے گرم چائے کی ایک پیالی سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ مجھے خالہ کا یہ سوال زہر معلوم ہوا۔ میری طبیعت بے اختیار چاہتی تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے چلانے لگوں کہ

"سنئے خالہ جان! نہ میں چائے پیوں گا نہ کھانے کی مجھے مطلق خواہش ہے آپ لوگوں کو دوسرے کے احساسات کا بالکل خیال نہیں ہوتا .... دنیا جہان کی باتیں آپ نے کر ڈالیں۔ محلے بھر کا حال بتا گئیں پھر چائے اور کھانے کی صلاح بھی کرنے لگیں لیکن یہ نہ ہوا کہ میری بیوی کا کچھ حال بتاتیں۔ آخر اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ سنتی ہیں آپ؟......"

لیکن میں یہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مجھ میں اس وقت جرأت پیدا ہو جائے، لیکن جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ مری ہوئی آواز میں بے دلی کے ساتھ میں بولا "چائے! ——— جی ہاں منگوا دیجئے۔ پی لوں گا"

"ہاں تھوڑی سی گرم گرم چائے پی لو تو ذرا جان میں جان آ جائے۔ تم تھک گئے ہو گے۔ اور دیکھو وہ سامنے کونے میں تمہارا بکس رکھوا دیا ہے شیروانی اتار کر ٹانگ دو منہ ہاتھ دھو ڈالو" اور یہ کہتی ہوئی وہ زینہ پر سے اتر گئیں

اسوقت میری طبیعت اس قدر الجھ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اپنی بوٹیاں نوچ ڈالوں میری الجھن کی حالت کسی طرح اس مجرم سے کم نہیں تھی جو امید اور مایوسی کی درمیانی حالت میں سر نکائے حاکم کے سامنے اپنے فیصلہ کے سنائے جانیکا انتظار کر رہا ہو اور حاکم انتہائی لاپرواہی اور بے خیالی کے ساتھ دوسرے کاموں میں اس طرح مشغول ہو جیسے اُسے آج کسی مقدمہ کا فیصلہ سنانا ہی نہیں ہے۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ کی وحشیانہ نوچ کھسوٹ میں شیروانی اتاری۔ جوتا اور موزہ بھی کھینچ تان کر پیروں سے علٰحدہ کیا۔ شیروانی کو کھونٹی پر ٹانگنے کے بجائے اُسے ٹوپی کے ساتھ پلنگ پر دے مارا، اور ایک بدمزاج ہارے ہوئے جواری کی طرح حواس درست کرنے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا ——— اتنے میں بڑی خالہ اوپر آ گئیں۔ آگے آگے وہ اور ان کے پیچھے ہاتھ میں چائے کی کشتی لئے ہوئے لڑکا ———

میری خالہ ہمیشہ سے بہت باتونی ہیں۔ اس قدر باتیں کرتی ہیں، اس قدر باتیں کرتی ہیں کہ جان عاجز آ جاتی ہے وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات انکی محبت آرام پہنچانے کے بجائے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اخلاق و تواضع کی انکے مذہب میں اس قدر اہمیت ہے کہ چاہے آپ علالت کا عذر کیجئے چاہے شکم سیری کا اُن کے آگے ایک بھی نہ چلے گی اور وہ ہمیشہ آپ کے عذر کو تکلف و شرم پر محمول کر کے جہاں تک اُن کا بس چلے گا آپ کو ٹھونسا ٹھونسا کر کھلا دیں گی۔ پھر چاہے آپکو بدہضمی ہو جائے چاہے معدہ خراب ہو اس سے اُنھیں کوئی غرض نہیں، وہ اپنی مادرانہ شفقت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو گئیں۔ بس، یہ احساس اُن کے ضمیر کو مطمئن کرنے

کے لئے کافی ہے۔

میں نے چائے دانی میں سے گہرے سنہرے رنگ کی خوشبودار چائے پیالی میں انڈیلنا شروع کی اور خالہ نے حسب عادت اپنے بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے تفنئے چھیڑ دئے۔

"حکیم صاحب کو لڑکی کے جہیز کی بڑی فکر ہے کہتے تھے کہ میرے نہ کوئی لڑکا نہ بالا —— بس لے دے کے یہی ایک لڑکی سارے گھر کا اجالا ہے مجھے اپنا روپیہ کوئی قبر میں تو لے جانا نہیں ہے کہ میں بیاہ میں ہاتھ روک روک کر پیسہ اٹھاؤں۔ اب اس موقع پر بھی ارمان نہ نکالوں گا تو یہ ساری جمع جتھا کس روز کام آئے گی۔ بس میاں اب تم یہ سمجھو کہ سارے کپڑے لتے گہنا پاتا تیار ہے فقط ایک چاندی کی مسہری تو البتہ کاریگر نے ابھی تک بنا کر نہیں دی باقی سب بیاہ کا سامان —— اے میاں شکر اور ڈالو بھلا دو چمچوں میں کیا ہوتا ہے؟ پھیکی چائے پینے سے کیا فائدہ۔ آج کل کے لڑکوں نے عجب رواج نکالا ہے کہ ہر چیز میں موئے فرنگیوں کی طرح مٹھاس کم ہو —— تو بھیا بس نکاح کی تاریخ ٹھرنے کی کسر ہے۔ باقی تو دونوں طرف سے سب ٹھیک ٹھاک ہے"

مجھے خالہ کی باتوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی میرا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور جب گرم چائے کی بھاپ میرے ماتھے سے ٹکراتی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ماتھا برف کی ایک قاش کی طرح سرد ہے۔ میں جھنجھلا رہا تھا کہ عورتیں فضول باتیں کرنے کی کس قدر عادی ہوتی ہیں خصوصاً گھر کی بڑی بوڑھیاں۔ جن کے پاس خانگی جھگڑے رشتہ داروں کی آپس میں شکر رنجیاں، بال بچوں کی علالت شادی بیاہ کے قصے، مہمانوں کے کپڑوں اور زیور کی نکتہ چینیوں کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں ہوتا ——

مجھے رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ میری خالہ تمام بے کار تذکرے جن سے مجھے کوئی سروکار نہیں اڑاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مجھ سے کوئی ایسا ذکر کریں جس میں میری بیوی کا نام آئے۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا نیچے صحن سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی نہ قدموں کی آہٹ کی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میری بیوی مکان میں موجود ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی گوشے سے اُس کی ہلکی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ یقیناً وہ فیض آباد سے نہیں آئی۔ اُفوہ مجھے اس وقت کس قدر صدمہ تھا!

میری خالہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"نواب صاحب کے نئے مکان میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے کرایہ دار اترے ہیں۔ ویسے ہیں تو حیثیت دار مگر ایسی دولت بھی کس کام کی جو مزاج بگاڑ دے۔ گھر کی عورتیں تو اس قدر بد دماغ ہیں کہ اللہ پناہ میں رکھے میں نے تو انہیں باتوں سے چل کر برسوں گھر کی اینٹوں سے جینوا دی۔ اے ہاں۔ کون ایسے سر پھروں سے میل جول رکھے — میاں واہ! تم تو خالی پیٹ میں چائے پئے چلے جا رہے ہو میں کہتی ہوں کہیں گرم گرم چائے خالی پیٹ میں نقصان نہ کر جائے پہلے کچھ کھا لو پھر چائے پینا" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نمکین سموسوں کی طشتری میری طرف سرکا دی۔ مجھے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے چائے تک کڑوی معلوم ہو رہی تھی کسی اور چیز کا کیا ذکر کرتا ویسے تو میں نے پوری پیالی کو چائے سے بھر لیا تھا لیکن ہر گھونٹ بے دلی کی وجہ سے آخری گھونٹ معلوم ہوتا تھا اور میری طبیعت چاہتی تھی کہ پوری چائے ختم کئے بغیر یوں ہی اٹھ کھڑا ہوں لیکن ساتھ ہی میں خالہ کی استبداد سے بھی واقف تھا اس لئے میں عجب

کشمکش میں بتلا تھا۔ مجھ سے چائے پی جاتی تھی، نہ باتیں کی جاتی تھیں نہ توجہ سے خالہ کی گفتگو سنی جاتی تھی۔ مجھے اس ایک لمحے میں اپنی خالہ سے انتہائی کوفت ہونے لگی دل چاہتا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے اُٹھ کر چلی جائیں ایک تو میں یوں ہی ان کی بیکار باتوں سے اکتا رہا تھا اس پر انکا اصرار اور بھی جلتے توے پر پانی کا کام دیتا تھا" اے یہ مٹھائی تو تم نے کھائی ہی نہیں۔ لو یہ سنترے چکھ کر دیکھو تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے"۔ اجی تم تو بیٹھے چائے سے کھیل رہے ہو۔ آخر کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں"۔ یا اللہ آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جب میں نے صاف صاف کہدیا کہ میری طبیعت نہیں چاہتی تو پھر آخر کیوں وہ کھلا کھلا کر مجھے مار ڈالنا چاہتی ہیں۔ میرے دل میں بچوں کی سی ایک مضحکہ خیز خواہش پیدا ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ جس طرح اُنھوں نے مجھے یہ بتایا کہ سنترے تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے اسی طرح وہ زعفرانی رنگ کے خوشنما حلوے کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے کہنے لگیں "اور یہ حلوا تمہاری بیوی نے بنایا تھا"۔ مگر میری بیوی سے تو انھیں جیسے چڑھ سی ہوگئی ہو کہ کسی سلسلے میں کسی طرح اس کا نام تک انکی زبان پر نہیں آتا ...... مجھے ہر چیز سے اس وقت الجھن ہو رہی تھی چائے کا گھونٹ حلق میں اٹک اٹک کر جا رہا تھا۔ کشتی میں کھانے کی چیزیں دیکھ دیکھ کر میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

کسی طرح جلدی جلدی چائے کی پیالی الٹی سیدھی ختم کرکے میں نے کشتی اپنے سامنے سے سرکا دی اور اس خیال سے کہ کہیں اسی وقفہ میں خالہ جان لڑکے کو کھانا لانے کا نادری حکم نہ صادر فرمادیں، میں نے جلدی سے پیش بندی کے طور پر کہہ دیا۔

" راستہ میں ریل پر بھی کچھ ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر یہاں آکر بھی اسوقت چائے پی لی۔ اب بھوک نہیں۔ اس وقت کھانا نہیں کھاؤنگا"۔ اے واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ لو بھلا تم نے کھایا ہی کیا۔ ساری چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹا تم نے تو کچھ چھوا تک نہیں۔ رات کو بے کھائے سونا اچھا نہیں۔ کچھ نہیں تو دو چار نوالے ہی کھا لو"۔

جھنجھلاہٹ کی وجہ سے میرے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن میں نے فوراً اپنے چہرے پر بناوٹی شگفتگی پیدا کرکے کہا "نہیں خالہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ سچ اس وقت مجھے بالکل بھوک نہیں ہے"۔

اس کے بعد میری خالہ نے بڑا سا پاندان اپنے آگے گھسیٹ لیا اور پان کی گلوریاں بنانے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر جلدی ہی مجھے کوئی ترکیب نہ سوجھی تو خالہ جان بغیر دس بارہ پانوں کی گلوریاں بنائے پاندان بند نہیں کریں گی اور اسمیں انھیں کسی طرح پندرہ منٹ سے کم نہیں لگیں گے۔ اس لئے کہ انھیں پان بناتے میں ادھر ادھر کی باتیں کرنیکا مرض ہے۔ میں نے پہلے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے منہ کھولا۔ پھر ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور آنکھوں کو بند کرکے ہلکے جھکولے کے ساتھ آگے کی طرف اس جھوم گیا جیسے مجھے بُری طرح نیند آ رہی ہو۔

"لو۔ تم تو اونگھ رہے ہو۔ آج گیارہ ہی بجے سے نیند آگئی کیا؟"

"میں نے فوراً بات بنائی رات کو ریل پر سونے کو تھوڑی ملا۔ راستہ میں مسافروں کی وہ بھیڑ تھی کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ ایک منٹ کو بھی پلک سے نہیں جھپکی"۔

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں عید کی نماز کے لئے تڑکے اٹھنا بھی ہے۔ پھر ماشاءاللہ بال بچوں کا گھر۔ وہ اندھیرے منھ ہی غل مچانا شروع کر دیں گے۔ پھر بھلا کوئی سو تھوڑی سکتا ہے۔ اور ہاں بچوں کے ذکر پر خیال آیا جمیلہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی اب کی دولھا بھائی آئیں گے تو میں اُن سے کتابوں کے لئے ننھی سی الماری منگواؤں گی۔ اسپر شاہد بولا میں کتابیں نکال کر پھینک دونگا اور اس میں اپنے کبوتر پالونگا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے تو بانی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر دھینگا مشتی ہونے ہی کو تھی کہ میں نے اُٹھکر بیچ بچاؤ کر دیا تب کہیں جاکر دونوں الگ ہوئے ہیں۔ جب تک تمہارے خسر گھر میں رہتے ہیں تب تک تو ذرا امن رہتا ہے۔ ادھر انھوں نے گھر سے قدم نکالا اور ادھر بچوں نے ادھم سے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ بعض وقت تو ایسا ناک میں دم آتا ہے کہ طبیعت چاہتی ہے سب کو پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دوں اور باہر سے کنڈی لگادوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اللہ رکھے انہیں کے دم قدم سے گھر کی رونق ہے۔ یہ ادہم شور تو جی کے ساتھ ......" میرا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا تھا، گستاخی کا خیال کئے بغیر میں جلدی سے ان کی بات کاٹ کر چلا اٹھا۔

"بس خالہ۔ اب آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور مجھے بھی نیند کی وجہ سے جھونکے پر جھونکے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت مجھے سو رہنے دیجئے۔ اب انشاءاللہ کل اطمینان سے باتیں ہونگی۔"

خدا خدا کر کے میری خالہ لیمپ کی روشنی اور کمرے کے بند کرنے کے متعلق کوئی نصف درجن متفرق ہدایتیں کر کے نیچے چلی گئیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اسوقت میرا مزاج درجہ بدرجہ چڑچڑا ہو رہا تھا اور مجھے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز پر خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا میں اپنی نظروں کے سامنے تمام خوشنما ہوائی محل ایک ایک کر کے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا میرے تمام ولولوں، تمام پر لطف توقعات کی عمارت ایک کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب میں بیشمار دولت ملنے کے بعد یکایک بیدار ہونے پر مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو کہ کسی عظیم الشان محل کی آراستہ خوابگاہ میں ریشمی پردوں کی شاہانہ مسہری پر سونے کے بجائے میں اپنے بستر ہی پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا ہوں — کمرے کی دیوار پر ایک پرانی وضع کی بھدی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ سامنے دالان میں ایک سیاہ بلی کے خرخر کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ مجھے بالکل یہ معلوم ہوا گویا گھڑی اور بلی دونوں میرے منصوبوں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔

میں جھنجھلا کر بستر پر دراز ہو گیا اور مجھے باری باری اپنے اوپر، اپنی بیوی پر اور اپنی خالہ پر غصہ آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر اپنے کو لعن طعن کرنے لگا کہ ایسی بھی بے تابی کس کام کی کہ ساری پڑھائی چھوڑ چھاڑ بیوی کی محبت میں دیوانوں کی طرح اتنی دور سے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ پھر مجھے اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا کہ عجیب لڑکی ہے بے سوچے سمجھے خط میں لکھ مارا کہ میں عید سے دو روز پہلے پہنچ جاؤں گی۔

لیکن سب سے زیادہ برہمی تو مجھے اپنی خالہ سے تھی کہ اتنا سن آگیا۔ زمانہ کے سیکڑوں تجربے حاصل کئے، اتنی اکل نہیں

قدرتاً متحیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مولوی صاحب آخر اس کتاب کو اپنی پرستش کے وقت کیوں پڑھتے ہیں۔ ایک خاص وجہ اور بھی سوال کے پیدا ہونے کی تھی، اور وہ یہ کہ مجھے میرے والد روزانہ شام کو رامائن پڑھنے کی تاکید کرتے اکثر جبراً پڑھاتے تھے۔ میری بیدلی کا ٹھکانا نہ تھا اور اکثر زد و کوب تک برداشت کر لیتا تھا۔ بلاشبہ میری حالت اوس وقت بجنسہٖ ملٹن کی لڑکی کی سی ہوتی تھی۔ جب میں نے وہی کتاب مولوی صاحب کو پڑھتے دیکھی تو مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے دبتے دبتے سوال کیا کہ مولوی صاحب، مجھے تو اسی رامائن کے لئے روز مار کھانا پڑتی ہے اور آپ کافروں کی وہی کتاب کیوں پڑھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے ہنسکر جواب دیا کہ کافر کے معنی ہیں خدا کی ہستی سے انکار کرنے والا اور رامائن یا ہندو مذہب اس ہستی سے منکر نہیں ہے، اس وجہ سے میں رامائن کو ہرگز کفر کی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ تو ہندو ہو کر اس پیاری بھاشا سے کیوں بے بہرہ ہے جسمیں لطافت کی انتہا نہیں؟ بھائی عربی، فارسی پھر بھی میرے لئے غیر ملکی زبانیں ہیں اور جو مزہ ہندی میں ہے وہ مجھے اُن میں نہیں آ سکتا۔ انھوں نے ہندی کی لطافت کی مثال بتلاتے ہوئے تان سین کے گائے ہوئے پد کی تفسیر کی تھی۔ جسودا بار بار یہ بھاکھے، ہے کوئی برج میں ہتو ہمار اچلت گوپال نہیں روکے انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب یہ پد اکبر کے دربار میں گایا گیا تو تان سین، بیربل، ٹوڈرمل، فیضی اور نواب رحیم خانخاناں نے اس پد کے کس طرح جدا جدا معنے بیان کئے جسمیں ادبی شغف و مذاق، دونوں کی شمولیت تھی۔ کسی وقت ناظرین نگار کے سامنے اُسی تفسیر کو پیش کرونگا۔ یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اُس دن سے میرے دل پر ایسا اثر پڑا کہ میں اَب بھی اپنی پوجا کے وقت تقریباً کل مشہور مذاہب کی کسی نہ کسی کتاب کا کچھ نہ کچھ ضرور ہی مطالعہ کرتا ہوں۔ مثلاً آج کل اپنی پیاری تلسی کرت رامائن کے ساتھ مثنوی مولانا روم و بدھ کا دھم پد و بائبل و تلک کا گیتا رہسیہ و سوامی داشانند کے اوپنشدوں کی تفسیر و ٹیگور کا ترجمۂ کبیر و ٹیگور کی گیتانجلی، ان سب کو تھوڑا تھوڑا بہت پڑھتا ہوں۔ میرے اکثر دوست اسے "کھچڑی" کہتے ہیں مگر مجھے تو اس کھچڑی میں وہ مزہ ملتا ہے جو علیحدہ طریقہ پر دال میں ہے، نہ چاول میں اور نہ مسالوں میں۔ اگر ایک طرف تلسی داس جی لکھتے ہیں۔ "جاں سکھو سوجانہو نرگن سگن سروپ۔ مم ہردے پنکج بھرنگ اوبسہو رام نرروپ" (جو شخص الغور کے حقیقی یا صفاتی حیثیت کو سمجھ سکتا ہو، سمجھے میرے دل کے کنول کے اندر تو ہے رام باتم انسانی شکل میں بھونرے کی طرح قیام کرو) تو دوسری طرف علامۂ اقبال بھی فرماتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اگر ایک طرف سعدی رح فرماتے ہیں "ید علیا بہ ید سفلیٰ کے مانند" تو دوسری طرف تلسی داس جی کہتے ہیں:۔

تُلسی کر (ہاتھ) پر گر کرے، کر تر کر تر نہ کرے۔ جا دن کر تر کر کرے تا دن مرن کرے۔ اگر کہیں یہ پڑھا کہ Beauty lies in the con[illegible]

تو فوراً نسیم کا یہ شعر یاد آ گیا کہ ؎

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پہ کشش مری پہونچ جائے

اس نقطۂ خیال سے ابھی حال میں صوبہ کی کونسل کے ایک سوال کے جواب سے یہ معلوم ہو کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا کہ ایک امتحان میں جہاں ہندوؤں کے صدہا لڑکے اردو لیکر شریک ہوئے تھے وہاں صرف ایک مسلمان لڑکے نے ہندی لی تھی۔ آہ رحیم

ملک محمد جائسی، رسکھان، مبارک کے قائم مقام کیا اب نہ ہوں گے جنھوں نے ہندی میں ایک لطافت کا دریا بہا دیا؟ کیا وہ محققانہ جوش سرد ہو گیا جس نے ہندوستان سے علم ہندسہ کو اودھار لینا بیجا نہ سمجھا تھا اور جس نے بغداد میں چرک و شسشرت نامی ویدک کتب کے ترجمے کرائے؟ فیضی کی رامائن و گیتا کے فارسی تراجم اب بھی یادگار ہیں۔ بھئی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ دوسرے کی علمی کتاب پڑھی اور بس مذہب تبدیل ہوا۔ مذہب کیا ٹھہرا کوئی کچا گھڑا ہو۔ میں اب بھی ویسا ہی ہندو ہوں جیسا ۲۰ سال قبل تھا بلکہ شاید بہتر۔ میں نے مولوی صاحب موصوف کے سے سچے خدا ترس اور پاک انسان کم دیکھے ہیں۔ آہ، مجھے موصوف کا ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے ہدیۂ ناظرین کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے ہم سبق بیجناتھ حلوائی کے مکان پر ایک قدیم قلمی رامائن معہ تفسیر کے موجود ہے۔ تحقیقات پسند دل بیتاب ہو گیا اور گو اس کے باپ نے بمشکل اس شرط پر رامائن کو دینا قبول کیا کہ روزانہ خود اس کا لڑکا رامائن لیجایا کرے گا اور مولوی صاحب کے سامنے دور (کیونکہ مولوی صاحب ملکش تھے نہ، کافر کا کیا مدمقابل انسانی نفرت نے گڑھا ہے!) اسٹول پر رکھدیگا اور وہی صفحات بھی بلٹتا جائیگا (آہ مولوی صاحب کے چھونے سے کہیں کتاب کی روحانیت نہ اڑجائے) مگر پھر بھی مولوی صاحب ہنسکر کہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں اس پاک کتاب کی کتنی عظمت ہے چنانچہ موصوف نے باوجود ان شرائط کے کل کتاب پڑھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں ہندی کے پاک خیالات اور خصوصاً تلسی داس جی کی رامائن کے جذبات اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ حال کی ملاقات میں حضرت نیاز فتحپوری نے براہ شفقت برادرانہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے سلسلہ مضامین کو اپنے رسالہ نگار میں شائع کرنا منظور فرمایا۔ مگر ناظرین نگار سے کچھ معذرت خواہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ "لیلےٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا لحاظ رکھتے ہوئے میری تفسیر میں جہاں موازنہ کی غلطی ہو اُسے کوتاہ نظری سے منسوب نہ کرتے ہوئے عبارت مجھے ایک خاص پہلو کا شیدائی یا سودائی سمجھیں۔ دوم یہ کہ بوستان کی ذیل کی روائتیں ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اسے فراخدلی سے کام میں جو خدا میں ہے یا اُن کے پیغمبر علیہ السلام میں تھی۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہفتاد سالہ گرسنہ آتش پرست پر رحم کرکے اسے ایک اسلامی قافلہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر جب شام کو سب لوگ معہ اُس آتش پرست کے دسترخوان پر بیٹھے اور اُس نے خدا کی پرستش میں حصہ نہ لیا تو اس بیچارے کو بھوکا ہی اُٹھا دیا گیا۔ فوراً غیب سے آواز آئی کہ اے مسلمو! تم نے یہ خیال نہ کیا کہ میں نے اس کی پرورش ستر برس تک کی باوجودیکہ وہ آتش پرست تھا۔ اور تم کو ایک وقت کا کھانا دینا بھی دشوار ہو گیا۔ دوسری روایت بھی عجیب سبق آموز ہے اور وہ یہ کہ حاتم طائی کے قبیلہ نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ حاتم کی وفات کے بعد محمد صاحب نے اُسکے ملک کو فتح کرکے اس کے قبیلے کے برگزیدہ اشخاص کو معہ حاتم کے لڑکے گرفتار کیا۔ اور قتل عام کا حکم صادر فرمایا، صرف لڑکی کو اُسکے باپ کے خیال سے چھوڑ دیا۔ مگر لڑکی آخر تھی حاتم کی اُس نے کہا کہ اگر آپ میری قوم کو تہ تیغ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاتم کی لڑکی ہو کر اُسکے نام کو کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے آپ پہلے قتل کیجئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی قوم کو اپنے سامنے اور جیتے جی تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھوں۔ محمد صاحب نے فوراً سب کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ اصل وجوہر " سے خطا نہیں ہوتی جس کا صاف مقصد

تھا کہ اصل "جوہر" کسی تنگ مذہبی دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بحرِ سخن کی طرح بحرِ حقیقت بھی ایک غیر محدود چیز ہے اور س کو ایک جگہ بند نہیں کر سکتے۔

اب دوسرے حصۂ مضموں میں رامائن کے ایک نہایت برگزیدہ حصہ کی تفسیر پیش کرتا ہوں جسمیں تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار زیرِ بحث ہے۔

(۲)

ی داس کی رامائن اور مارا قومی معیار

مارچ ۱۹۲۵ء کے رسالہ زمانہ میں "تلسی داس کا شاعرانہ کمال" والے مضمون کے عنوان میں مہاتما گاندھی کا وہ قول میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں جسمیں مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ میرے دلی جذبات کا ابھار جس قدر تلسی داس جی کی رامائن اور گیتا سے ہوتا ہے اوتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ کے تھوڑے ہی دن بعد لالہ ہردیال جی کا ایک مضمون پرتھا (کانپور) میں میری نظر سے گزرا جسمیں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ تلسی داس جی کی رامائن ماری ایک خاص قومی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور جس طرح ڈیوک آف ولنگٹن (مشہور و معروف انگریز سپہ سالار جس نے نپولین اعظم واٹرلو کے میدان جنگ میں شکست دی تھی) کہتا تھا کہ اُس کا تاریخی مطالعہ سیکسپیر کے ڈراموں ہی سے ہوا ہے اسی طرح ہم انی تہذیب کے اصولوں کا مطالعہ اس مقدس کتاب سے کر سکتے ہیں جو تاریخ کا اصل مقصد ہے۔ تلسی داس جی کے سہ صد سالہ یادگاری ٹن کے موقع پر پنڈت مدن موہن مالوی نے فرمایا تھا کہ حصول آزادی کی پہلی منزل وہی ہے، جو تلسی داس کے خیال کی آزادی سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیروں کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے بھی گویا رام راج میں ہیں ان خیالات کے ذریعہ رام راج کے اصولوں شاعرانہ دلکشی کے ساتھ تمام قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوامی شردھانند جی مرحوم نے بھی اپنی شردھا (دلی عقیدت) اس پاکیزہ خیال شاعر کے قدموں پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اچھوت قوموں کے ساتھ وہی برتاؤ لازم ہے جو رام نے نشاد، سیوری، کول، رات وغیرہ کے ساتھ کیا تھا اور جسے تلسی داس نے اپنی رامائن میں عجیب بھگتی اور پریم کے رنگ میں دکھلایا ہے۔ واچسپتی پنڈت پندیال شرما نے وحدانیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلسی داس جی کے اس استعارہ سے بڑھکر ایشور اور مادی دنیا کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے کوئی استعارہ ملنا محال ہے کہ ایشور دنیا میں اس طرح بس رہا ہے جیسے حنا میں سرخی کہ نظر نہیں آتی مگر موجود ہے۔ پروفیسر گریرسن تو تلسی کے مقابلہ میں کسی اور مشرقی شاعر کو شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ المختصر تمام مختلف الخیال لوگوں کی نگاہیں اس وقت عجیب امید کے ساتھ تلسی داس کی رامائن پر پڑ رہی ہیں اور تلسی داس جی کا خود دعویٰ بھی یہی ہے کہ کلجگ کے لئے رام بھجن اور رامائن کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ نجات نہیں ہے۔ رحیم خانخاناں بھی تلسی داس جی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک برہمن کی لڑکی کی شادی میں امداد کی سفارش کرتے ہوئے جب تلسی جی نے سفارشی خط میں یہ لکھا کہ "سُر (دیوتا) تیا (عورت) نر (آدمی) تھا ناگ تیا سب چاہیں اس ہوئے" تو رحیم خاں نے اسپر گرہ لگا دی کہ ہلسی (تلسی داس کی والدہ کا نام) ہوں ہلسی (خوش) بھیویں تلسی سوں سُت (لڑکا) ہوئے"۔ میں بھی اس خزانہ سے ایک انمول موتیوں کا ہار ناظرین نگار کی

خدمت میں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ آہ! نہ یہ موقع ہے اور نہ میں ایسا جوہری ہوں کہ اس ہار کے ہر موتی کی آب و تاب کو پورے طور پر دکھلا سکوں مگر ہاں، ہار کے کچھ عام اوصاف بیان کرتے ہوئے نہایت ادب سے اپنی ناچیز نذر کو پیش کرتا ہوں ۔
انیسویں صدی اپنی تمام مادی ایجادوں کے ساتھ اگر خدا کو بھول نہ گئی تھی تو اس کی ہستی پر شک ضرور کرنے لگی تھی اور مغربی دنیا میں نباتات و حیوانات کے طبقات میں محض طاقتور کی فتح کے اصول کو اپنی یکرخی نظر سے دیکھکر اُسی کو اپنا معیار مان بیٹھی تھی اور کمزور فرد یا قوم کے لئے موت یا زوال کی دعوت کے سوا اور کوئی تحفہ اس کے پاس نہ تھا۔ مساوات کا مسئلہ بھی انقلاب فرانس کے وقت سے خونی آزادی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مزدور مالک کے دشمن، رعایا حکمرانوں کے خون کی پیاسی، قوم قوم کے گلے میں طوق غلامی ڈالنے کو تیار، اور پھر لطف یہ کہ ہر شخص کی زبان زدہ ہی مساوات و آزادی کا راگ یہی نظارہ کم و بیش اس بیسویں صدی میں بھی نظر آتا ہے، ملک الشعرا ٹیگور اپنی کتاب نیشنلزم (nationalism) میں مغرب کے خیالِ قومیت کا ایک عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل الفاظ میں ہے :۔

"اس قومی خیال والے بھوت کے خوف سے ساری زمین تھرا رہی ہے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں بدگمانی اور خفیہ نقصان رسانی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے .... اس قومی خیال کی حرکت کہیں گرد و نواح میں ذرا بھی ہوئی کہ فوراً لوگوں کے کان کھڑے ہوے اور ایک خوف کا احساس چاروں طرف پھیل گیا۔ خوف ہی انسانی طبائع کے جملہ بُرائیوں کی بنیاد ہے ...... لوگ، کذب و عیاری پر اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، قرار ہائے صالح پر محض اُنکی صلاحیت کی وجہ سے مضحکہ زنی ہوتی ہے۔ اس قومی (خیال) کا خلاصہ منشا صرف یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی کمزوری سے مستفید ہو جسکے لئے استعارہ صرف ان کیڑوں سے لیا جاتا ہے جو مفلوج گوشت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ اونکا مقتول صرف اس قدر زندگی قائم رکھے کہ ان کی زبان کے ذائقہ اور انکی شکم سیری کا سامان ملتا رہے۔"

اس لئے موصوف گزشتہ جنگ یورپ کو اسی گناہ کی سزا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جبتک شرقی اصولوں پر عملدرآمد نہ کیا جاویگا اسوقت تک لیگ آف نیشنس (League of nations) محض طائفہ دزد اقال بنی رہیگی۔ شاعر موصوف فرماتے ہیں کہ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مادی طاقت اپنے خون آلود قدموں کے دہونے کی خواہش ضرور کریگی اور وہ ہندوستان سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنی پاک تہذیب کے گنگا جل کا برتن تم بھی صاف کر کے تیار رکھو کیونکہ تمہاری ہی طرف دنیا کی نگاہ ہوگی۔
ایک طبقہ (اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے) ہندوستان میں بھی ایسا ہے جو اسی مغربی خونین ناٹک کے تماشہ کو ہندوستان کے اسٹیج پر بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب کا گنگا جل مغرب کے گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کرے خود اسی گناہ میں مغرب کا پیرو ہونا چاہتا ہے۔ ایک اور طبقہ مغربی تہذیب سے اس قدر بیزار ہے کہ اس کے معیار زندگی کے علاوہ اس کی علمی تحقیقات اور تنظیمی اصول پر بھی اسی قومی خود غرضی کا خونیں رنگ دیکھتا ہے اور فرطِ خوف سے اوسے چھونا ہی پسند نہیں کرتا۔ ایک گروہ اہنسا (عدم تشدد) کے اصول کا ایسا گرویدہ ہے کہ اس کی بزدلی پر مہاتما گاندھی کو بھی شرم آتی ہے اور دوسرا گروہ اپنے کھلونے کے

نیام میں انجان بچوں کی طرح اپنے کھلونے کی تلوار ہی کو کھڑکھڑاتا ہے اور یہ بھی مغربی اسلحۂ جنگ کے دیو کے سامنے ایک فرقہ تمدن اور سیاست کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں ہے۔ دوسری طرف مذہب کی آڑ میں وہ جوتی پیزار کی نوبت ہو رہی ہے کہ باید و شاید۔ ان سے نرالا ایک تیسرا طبقہ ہے جو اِن دونوں پر نظر تضحیک ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ تمدن اور سیاست کے مسائل میں مذہب اور روحانیت کا گزر نہیں ہے، انھیں تو خانقاہ یا حرم کے حوالہ کرنا چاہیے۔ اور جائے غور یہ ہے کہ ہر طبقہ میں ہندوستان کے برگزیدہ اور قابل اصحاب شامل ہیں جن کی حب الوطنی اور خلوص عقیدت پر شبہ کرنا بھی بیجا ہے۔

مادی طاقت اور روحانی طاقت کے تضاد کا نظارہ ایک مرتبہ راون اور رام کی شکل میں، آپکے ملک میں پیشتر بھی دیکھا جا چکا ہے راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھکر بھیکھن جیسے راسخ الخیال اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر میں مہاراج رام کے جواب کو بزرگان قوم اور بالخصوص مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہی نہ صرف ہمارا بلکہ کل دنیا کا معیار ہونا چاہیے یہ وہی گنگا جل ہے۔ جسے آپ مغرب کے خونیں گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں یا دوسرے استعارہ میں یہی وہ "نولکھا ہار" ہے جسے مادر گیتی کی پرستش کرتے وقت اُس کے گلے میں پہنا سکتے ہیں۔ مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اس کے اجزا کی تفصیل، اے بھیکھن سنو:-

सौरज धीर जाहि रथ चाका । सत्य शील दृढ़ ध्वजा पताका

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جسکے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔

बल विवेक दम परहित घोरे । क्षमा दया समता रजु जोरे

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پر اوپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں

ईश भजन सारथी सुजाना । विरत चर्म सन्तोष कृपाना

ایشور کا بھجن اس رتھ کا چلانے والا ہے اور جو بہادر اسپر سوار ہے اسکی ڈھال بیراگ اور اس کی تلوار قناعت ہے

दान परसु बुधि शक्ति प्रचण्डा बर विज्ञान कठिन कोदण्डा

فیاضی اس کا پھرسا اور عقل سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اسکی مضبوط کمان ہے۔

अमल अचल मन त्रोन समाना । संजम नियम सिली मुख नाना

پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصول اخلاقِ ذاتی) اور نیم (اصول اخلاق تمدنی) تیر ہیں۔

कवच अभेद विप्रपद पूजा पहि सम विजय उपायन दूजा

زرہ بکتر سچے برہمن کی خلوصِ دل سے پرستش ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

सखा धर्म मय अस रथ जाके जीतन कहन न कतहुं रिपुताके

محب من، جسکے پاس اب دھرم کا رتھ ہے اس کی فتح کے لئے کہیں دشمن ہی نہیں ہے۔

یہ سات چوپائیاں ساری مشرقی تہذیب کا لب لباب ہیں۔ میری دلی منشا تو یہ تھی کہ بس انھیں کو پیش کرکے بلا کسی تفسیر کے محبان قوم کے سامنے سے ہٹ جاتا مگر چند وجوہ سے کچھ تفسیر لازمی ہے جس کو خاص اصول کے لحاظ سے نمبروار درج ذیل کرتا ہوں:۔

سچائی اور محبت بہادری اور طاقت پہلی چوپائی کا پہلا ہی لفظ بہادری ہے اور دوسری چوپائی کا بھی۔ پہلا ہی لفظ طاقت کا مترادف ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اہنسا کے اس خیال کی جو بزدل بناتا ہے، گنجائش کسی قومی یا دنیاوی معیار میں نہیں ہے۔

مگر بہادری کے ساتھ سچائی اور محبت پہلی ہی چوپائی میں موجود ہیں اور طاقت کے ساتھ تمیز اور نفس کشی توام ہیں کہ کبھی بہادری محبت اور سچائی کا خون کرتے ہوئے کمزور کے گردن میں طوقِ غلامی نہ پہنا دے اور دیو کی طاقت رکھتے ہوئے وہ کہیں واقعی دیو نہ بنجاوے۔ مہاراج رام کی زندگی میں برابر یہی اصول کام کرتا رہا کہ کبھی کسی سے لڑائی نہ مول لینا۔ مگر جسوقت کسی نے (مثلاً پرسوام نے) چیلنج دیا تو "موت سے بھی رگھو بنسی نہیں ڈرتے" اسی ایک صدا کا بلند ہونا۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی سے مہاراج رام کا صلح کے لئے انگد کو راون کے پاس بھیجنا وغیرہ کتنے ہی ایسے نمونے موجود ہیں۔

تثلیث نفس۔ آہ مغربی دنیا کس فخر سے کہتی ہے کہ فرانس کی انقلابی تحریک کے یہی تین الفاظ نئی دنیا کے ترقی اور آزادی کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ آزادی، مساوات اور اخوت۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جاوے تو مغربی آزادی کے ساتھ بیچارہ مساوات کی بھی مٹی پلید ہوئی ہے۔ مغربی آزادی کے اس خیال کے توام ہوتے ہوئے بھی کہ ہم ہر حالت میں کسی نہ کسی قید میں ہیں قید کے توڑنے کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ مزدوروں کو مالداروں کے قید سے رہائی کا خیال، رعایا کو حکومت سے آزاد ہونیکا خیال، مذہب کو کتابی پابندیوں سے نجات پانے کا خیال، ایک قوم کو دوسری قوم کے تعلقات کے قید سے نکلنے کا خیال اس قدر دامنگیر رہتا ہے کہ ہر طرف توڑ پھوڑ اور کشت و خون برابر جاری ہے۔ غرضکہ اپنی زنجیر کو توڑکر دوسرے کے پیروں میں جکڑنا یہی عمل اثر اس آزادی کے خیال نے مغرب میں ہر جگہ آشکارا کر رکھا ہے۔ مغربی اقوام کے خون آلودہ ہونے کی باعث یہی ہے۔ مساوات کا خیال نہایت اچھا تھا مگر وہ بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا کہ اپنے سے بہتر حیثیت میں کسی کو نہ دیکھ سکے۔ آہ، کب مغرب نے اس خیال سے کمزوروں کو اپنے برابر بنانے میں کام لیا؟ اور اخوت بیچاری تو تیسرے درجہ پر رہ گئی ہے اور بقول ٹیگور کے قومی خیال میں اُسے وہ جگہ ملی جو محافظ قزاقاں میں برادرانہ اصول کو اپنا شیرازہ تنظیم محض اس لئے مستحکم کرنے میں ملتی ہے کہ دوسروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ ہو سکے، کیا کبھی سفید مغرب نے کسی رنگدار قوم کو اپنا بھائی سمجھا؟ کیا مغرب کی مختلف اقوام میں ایک دوسرے سے یگانگت قائم رکھنے کا خیال مستحکم ہے؟ کیا مزدور مالدار کو اور محکوم حاکم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تلسی داس جی کے وقت

بالا میں بھی مساوات ہے مگر اس کے ساتھ عفو اور رحم بھی شامل ہیں۔ عفو خود بتلاتا ہے کہ جس نے ہم پر ظلم کرکے مساوات سے باز رکھا اسے بھی مساوات کے حاصل ہو جانے پر معاف کیا جاوے تاکہ سینہ میں کینہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ مہاراج رام نے بالی کے مارنے کے بعد بھی عفو کا خیال رکھا اور ایسا ہی ہر وقت کرتے رہے۔ اس میں مساوات بھی مل جاتی ہے اور دوسرے کی مساوات بھی زائل نہیں ہوتی۔ مگر آج فرانس اپنے انقلاب کے خونیں نقشہ کو جس میں انسانی سر مولی اور گاجر کی طرح بیرحمی سے بلا کسی عفو و امتیاز کے خیال کے کاٹے گئے، بطور معیار پیش کرنا باعث شرم نہیں خیال کرتا ہے۔ اسیطرح عفو کے ساتھ سزا دینے والا بھی ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ :-

Human power then looks like God's when mercy seasons justice

(انسانی طاقت اسوقت خدائی طاقت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جب انصاف کے ساتھ رحم ہو) دوسرا خیال جو تلسی داس جی مساوات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ "رحم برحالِ دیگران" یعنی جو اپنے سے نیچے ہیں اُنھیں اُٹھانے۔ یعنی سیوری دنشاد، کوئی دکرات پر رحم ([illegible]) کرنا کہ وہ بھی اگر تمھارے برابر نہیں تو کم از کم اپنی موجودہ حالت سے تمھاری امداد اور محبت کے سہارے اوپر اٹھ سکیں۔

البتہ تلسی داس کے خیال میں "سب دہاں بائیس پنسیری" والی مساوات کبھی نہیں تھی۔ ہندوستانی نظامِ تمدن میں روحانیت کو پہلا، جسمانی قوت کو دوسرا، مال و تجارت کو تیسرا اور دیگر خدمات کو چوتھا درجہ دیا گیا تھا مگر یورپ میں بجز مال و دولت کے اور کسی چیز کی پرستش ہی نہیں ہے۔ روحانیت کو تو کوئی کوڑی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ انتخاب میں بھی صرف مالی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مالوی جی نے بڑے لاٹ کی کونسل میں کہا تھا کہ آپ کے قاعدۂ انتخاب نے تو ہندوستانی تہذیب کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ لالہ بھگوان داس نے بھی کچھ کوشش کی تھی کہ بیچاری روحانیت کو بھی کوئی جگہ مل جاوے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب تک مختلف طبائع موجود ہیں، یہ اندھا دھند کی مساوات چل نہیں سکتی یہ بات اور ہے کہ آپ حیوانی طاقت یا زبانی شور و غل (Eloquence) یا سرمایہ (Capital) یا غوغا کرنے والی جماعتوں کے اتحاد کو مقدم سمجھیں اور بیچاری روحانیت کو موخر سمجھکر ٹھکرا دیں میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کل دنیا کو بجائے آزادی و مساوات و اخوت کی تثلیث لفظی کے تلسی جی کی تثلیث لفظی (समानता, दया, क्षमा) عفو و رحم و مساوات کو قبول کرکے اپنے خون آلودہ ہاتھوں کو پاک و صاف کر ڈالنا چاہیئے۔

قومی جھنڈا

قومی جھنڈے کی پکار (کچھ عرصہ ہوا) ہر طرف بڑے زور سے تھی اور اس کے متعلق نئے نئے خیالات کا اظہار ہوا تھا مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس میں قومی تنظیم کا شائبہ دکھلانے کی غرض سے مختلف فرقوں کے لئے مختلف رنگ دکھلائے جاویں اور قومی مساوات و مالی آزادی کا خیال دلانے کے لئے اسمیں چرخہ کا نقش ہو۔ مگر صاحبان، قومی جھنڈے کے الفاظ اور نشانات محض مغرب کی نقل ہیں جن کے لحاظ سے کسی بیرونی مادی شے کے تصویر ہونا ضروری ہے۔ کاش

کسی وقت ایک ہی مذہب رہگیا یا سب کے سب ہم مذہب ہوگئے یا چرخہ سے قوم آگے بڑھ گئی تو یہ جھنڈا پھر بدلنا پڑے گا۔ دیکھئے تلسی جی قومی جھنڈے کے لئے کیا تبلاتے ہیں:۔

جھنڈے پر सत्य, शान्ति, प्रेम और स्वतन्त्रता لکھا ہو۔ اگر کوئی تنظیم رنگوں کی رکھی جاوے تو ستیہ (सत्य) کا رنگ سفید اور شیل (शान्ति) کا سُرخ ہو اور کا لفظ ہر دو پر بسیط ہے۔ اس طرح قومی دماغ کے لئے سچائی کا اصول اور قومی دل کے لئے محبت کا جذبہ معیار بنکر قومی روح کو پاک بنا دیں گے اور دنیا کے سامنے ایک مرتبہ پھر وہی جان برائٹ (John Bright) کا قول پیش کریں گے کہ جو عظمت اخلاق پر قائم نہیں ہے وہ کبھی مستحکم نہیں ہوسکتی۔

مساوات و آزادی و اخوت یہ تین کیا، دنیا کے کل اخلاق کے افرادی صفات انھیں دو الفاظ सत्य اور शान्ति میں شامل ہوسکتے ہیں اور ہیں۔ مگر ہر دو کا مستحکم اور توام ہونا ضروری ہے کیونکہ راستی "فتنہ انگیز" ہوسکتی ہے اور اہنسا انسان کو ناراستی کے مقابلہ میں بزدل بنا سکتی ہے۔ اسلئے معیار صرف ستیاگرہ نہ ہوکر सत्य शान्ति आग्रह ہونا چاہئے ورنہ خونیں ہنگامے اور چوری چورا کے واقعے ہونا ہر وقت ممکن ہے۔ آہ، دنیا ابھی تضحیک کی نظر ستیاگرہ پر ہی ڈال رہی ہے اور نہ معلوم کہ اس اصول کے مروج ہونے کے لئے ابھی کتنا زمانہ چاہئے۔ تلسی کا معیار ستیہ شیل آگرہ (सत्य शान्ति आग्रह) تو بیشتر لوگوں کو اجتماع ضدین ہی معلوم ہوگا۔ مگر معیار ہمیشہ بلند ہی ہونا چاہئے۔ اگر کسی قومی جھنڈے پر یہ الفاظ ہوں وہ قوم ایمانداری کے ساتھ اس جھنڈے کے نیچے ہوکر آگے بڑھے تو بجائے اس خوف کے جو مغربی اقوام کیجانب سے مشرقی اقوام میں پھیلتا ہے ایسی قوموں کا استقبال ہی ہر جگہ ہو اور یہ مسئلہ کہ پہلے مذہب (پادری) پھر تجارت اور اس کے بعد قومی سلطنت کا جھنڈا چلتا ہے، دنیا سے مٹ جاوے اسی معیار کی وجہ سے رام کا استقبال کیا پوریں ہوتا ہے اور (Annexation Policy) کا پتہ نہیں۔ بال کا راج سگریو کے اور فتح لنکا کے بعد لنکا کا راج بھیکھن کے سپرد ہوتا ہے، نہ کہ دوسری قوم کے مال و متاع سے اپنی شکم سیری اور مزے اڑانے کے خیالات کا پیدا ہونا۔ کیا اچھا ہوتا اگر بغیر امتیاز کے مساوات کے بجائے سچائی کا برتاؤ ہوتا۔ مورخ البیرونی ہندوستان کے قومی شیرازہ کی تنظیم کو عدم مساوات مگر راستی کے اصول پر دیکھکر کہتا ہے کہ گو مساوات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت دوسری جگہ بہت جلدی ہوئی مگر یہاں ہندوستان میں باوجود عدم مساوات کے ہر شخص اپنی جگہ پر خوش ہے اور کوئی خاص بےچینی نہیں پائی جاتی۔

ایشور ایشور کا خیال تہذیب کا خاص جزو ہوتا ہے۔ دراصل وہی تہذیب کے رتھ کا چلانے والا رتھ بان ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوے کہ سر اولیور لاج (Sir Oliver Lodge) جیسے زبردست سائنس دان نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ جس روحانیت کی چوٹی پر ایمان اپنے پروں کے اوڑان سے پہونچا ہے اسی جگہ سائنس بھی اب پہونچ رہی ہے اور روحانیت و سائنس کا تضاد اب مٹتا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے

جیسے مفلس ملک کے لئے سائنس کے ذریعہ بہت سی فلاحی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے کیونکہ بقول تلسی "بھوکھے بھجن نہ ہوئے گوپالا" کوری روحانیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ مگر کتنا ہی بڑا سائنسدان یا مدبر کیوں نہ ہو، دنیا اب سمجھتی جاتی ہے کہ بلا خدا کے تنہا اپنے برتے پر ناخدائی کا دعویٰ محض باطل ہے۔

کسی کی پرستش ہو؟

تلسی داس نے आदि भेद विप्र पद पूजा پر بہت زور دیا ہے اور بعض لوگ اس وجہ سے اُن کو بُرا کہتے ہیں۔ مگر विप्र کون ہیں؟ وہ لوگ جنھوں نے روحانیت کے لئے سب کچھ ترک کر دیا ہے اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج بھی کیا وجہ ہے کہ سوامی ودیکا نند، سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی کو دیکھکر یورپ و امریکہ متحیر ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ملک ایسا ہے جہاں پیغمبر پیدا ہوتے ہیں تو وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایسے افراد ہی تو دراصل विप्र ہیں اور روحانیت و ایثار کی پرستش ہی دنیا کی نجات کا وسیلہ ہوسکتی ہے۔ افلاطون بھی ایسے ہی لوگوں کی تیاری کا اپنے مکالمہ میں سبق دیتا ہے اور انھیں کو [illegible] کہتے ہوئے انکی سلطنت کو سب سے بڑھکر مانتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں واضعان قانون ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے اور سلطنت کا کام جسمانی اور دماغی قوت رکھنے والے چھتریوں کے سپرد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی چیز کی پرستش ضروری ہوتی ہے پارلیمنٹ کی حکومت میں زبان (لسانیت) اور مال و دولت کی پرستش ہوتی ہے یا اور طرح کی غیر مہذب حکومت میں مادی قوت کی علانیہ پرستش سر فریڈرک ہریسن صاحب مرتے مرتے اس افسوس میں رہے کہ آٹھ سو برس کی ترتیب کے بعد بھی انگلستان میں کاروبار سلطنت کے لئے قابل افراد کا چناؤ ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی اپنے انگریزی اخبار پیوپل میں لکھا تھا کہ ولایت میں بھی بے لوث اور بنی نوع انسان کو یکساں سمجھنے والے شخص کے لئے پارلیمنٹ کے چناؤ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی کی نقل مطابق اصل بھی نہیں بلکہ اس سے بھی خراب تر حالت ہندوستان میں ہے۔ بزرگان قوم کو نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے اور بے نفس، بے لوث مگر بے ثروت اصحاب کو اپنے نظام سلطنت میں خاص جگہوں پر مامور کرنے کا انتظام ابتدا ہی سے کرنا چاہئے۔

مغربی دنیا میں سوشلزم کی وہ لہر ہے کہ "کل مال کل قوم کا ہے" یہ مسئلہ کتنوں کو متوالا بنائے ہوئے ہے۔ مگر دیکھئے اروس میں لینن جیسا شہرہ آفاق مدبر بھی اس مسئلہ کو سال بھر تک بھی نہ چلا سکا، کیونکہ پھر بقول ایک دہقانی مقولہ کے کہ "ساجھے کی کھیتی کو گدہا بھی نہ کھاوے" کوئی ترقی کی پرواہی نہیں کرتا۔ اور کاہلی کے سوا جدوجہد کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہندوستانی یا مشرقی سوشلزم کیا تھا۔ دان یعنی سخاوت پر زور دینا۔ گو اس اصول کا استعمال فی زماننا خراب کیا، نہایت ہی خراب طریقہ پر ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر بیوہ ہر یتیم، ہر بوڑھے اور ہر لولے، لنگڑے اندھے کا سہارا ہمیشہ دان ہی رہا ہے۔ کسی غیر ملکی پادری نے اس کرشمہ کو کہ یہ کل کام بلا مدد گورنمنٹ کے ہوتا ہے، نہایت استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو طبقے زیادہ کماتے ہیں اونہیں پر سخاوت ایک مذہبی فرض ہے اور اسی لئے غریب کے منہ سے بجائے بددعا کے ایسے نظام کے حق میں دعا ہی نکلتی ہے۔ ہاں سخاوت کا جائز انتظام کرنا اور اوسے قومی فرض بنانا، ایک ضروری ذریعہ اس کی درستی کا ہے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کہیں مغرب کی نقل میں کشمکش شروع ہو جاوے اور سخاوت کے بجائے

نوچ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ میں تو ہندو نظام کو Voluntary Socialism یا (طبعی سخاوت) کا نام دیتا ہوں جسمیں جہاں دولت ضرورت سے زیادہ ہوئی کہ دان میں تقسیم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ راجہ ہرش جیسے سخی بادشاہ ہر تیسرے برس اپنا کل خزانہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس نظام کے ہوتے شخصی کوشش بھی نہیں مٹتی اور سوشلزم کا مفاد بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

سر فریڈرک ہریسن صاحب نے جو نوے برس سے زائد عمر کے ہو کر ابھی حال میں راہی ملک عدم ہوئے ہیں، اپنی آخری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیسویں صدی کا غلط خیال کہ قدرت میں صرف "طاقت کی فتح" کا اصول کام کرتا ہے اٹھتا جاتا ہے اور یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ قدرت میں بھی ایثار کا اصول بچوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ لا محدود طریقوں پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہذا دنیا کا رجحان اب بجائے دوسری قوموں کو زیر کر کے ان سے اپنی شکم پوری کرنے کے، باہمی امداد و اتحاد کی طرف ہونا چاہئے۔ امریکہ کے اخباروں میں یہ پکار برابر سنائی دیتی ہے کہ مادی ترقی کی دیوانہ وار دوڑ میں اسکو دلی اطمینان اور سکون نہیں ملا۔ ایک شخص نے ابھی حال میں امریکہ سے لکھا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے تیار کردہ مال کے خریدار کم ہو جاویں اور سادگی کی ترقی ہو تو ہمارے سب مادی ترقی کے سامان، خوشنما باغ، عالیشان مکان اور بڑے بڑے دعوتی جلسے کہاں ہوں گے؟

کچھ عرصہ ہوا کہ جرمنی اور امریکہ سے مہاتما گاندھی کو دعوت دی گئی تھی کہ مغرب لڑائیوں اور مشینوں کی حیوانی زیادتیوں سے تنگ آگیا ہے۔ پس آپ تشریف لا دیں اور اپنی پاک ہدایت سے ہماری مدد کریں۔ آہ کیا حسرتناک جواب مہاتما جی کو دینا پڑا کہ میرے ساتھ میرے ملک ہی کی تعلیمیافتہ جماعت نہیں ہے اور جب تک یہ جماعت میرے ساتھ ہو کر میرے ملک کی آزادی حاصل کر کے میرے اصولوں کو مضبوط نہ ثابت کر سکے، میں اپنی موجودہ کمزوری کی حالت میں باہر نہیں جانا چاہتا۔

میری یہ منشا نہیں ہے کہ جائز اختلافات بھی باقی نہ رہیں اور نہ اندھے کی سی تقلید ہو مگر کم از کم قومی معیار کیا ہو، اسپر ضرور اتفاق ہونا چاہئے۔ اور اس معیار کے قائم کرنے میں ملک اور قوم کو تلسی داس جی کی رامائن سے ضرور سبق لینا چاہئے۔

راج بہادر لمگوڑا۔ ایم اے
ال ال بی

بلادِ مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے

"آنسہ عنبرہ سلام" ایک مشرقی نا کتخدا خاتون نے حال ہی میں بلادِ انگلستان کی سیاحت کرکے اپنے جو جذبات بیروت کے عربی مجلہ کشاف میں شائع کئے ہیں وہ ناظرین نگار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، نہ اس لئے کہ ان میں بلادِ یورپ کی کوئی نئی داستان نہضت و ارتقاء پنہاں ہے، بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب مشرقی خواتین کے زاویۂ نگاہ میں بھی کتنا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ حالات بہت دلچسپ ہیں اور متاثر ہونے والے کے جذبات اس سے زیادہ دلکش ہم کہاں ہیں اور دنیا کہاں جا رہی ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں اور دنیا کیا کر رہی ہے؟ یہ ہے اصل روح اس تاثر کی جس کے ماتحت "آنسہ عنبرہ" نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔

نیاز



جس وقت میں نے بلادِ انگلستان میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کو صرف "ہیبت و حیرت" کے الفاظ سے تعبیر کرسکتی ہوں۔ چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے مکانات، وسیع تجارتگاہیں، خاموش ہجوم، نظم و اہتمام، صفائی و پاکیزگی، اور اسی طرح کی اور بہت سی خصوصیات جو بیک وقت انسان کو متاثر کرتی ہیں، ان کا نام ہے بلادِ انگلستان اوّل اوّل تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن جب چند روز تک قیام کرنے کے بعد میں نے یہاں کی اسلوب زندگی اور اجتماعی روح کا مطالعہ کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ایک اجنبی اوّل اوّل یہاں کی فضا اور یہاں کے آسمان و زمین میں ہیبت ہی ہیبت محسوس کرتا ہے۔

حریتِ شخصی انگلستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت وہاں کی حریتِ شخصی ہے، جو وہاں کے ذرہ ذرہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس سے ہر شخص اس کے نہایت وسیع معنے میں فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ وہاں کے نظام، وہاں کے آدابِ عامہ اور امنِ عام میں خلل نہ پیدا ہو۔ وہاں ہر شخص اپنی رائے اور اپنے قول و عمل میں آزاد ہے اور اس کا بیباکی سے اعلان کرسکتا ہے۔ جو چاہو کرو، جو جی میں آئے کہو کیونکہ حریت وہاں کی دیوی ہے اور اس نے اپنے ہر بندہ کو بالکل آزاد و مطلق العنان چھوڑ رکھا ہے۔ ہائڈ پارک میں جاؤ تو تم دیکھوگے کہ اتوار کے دن ہمیشہ اور باقی ایام میں بھی کبھی کبھی خطیبوں کا ہجوم ہوتا ہے، کوئی یہاں کھڑا ہوا سیاسیاتِ انگلستان پر نکتہ چینی کر رہا ہے، کوئی وہاں اشتراکیت پر لکچر دے رہا ہے، کوئی فوضویت کی تعریفیں کر رہا ہے، کوئی ملوکیت کے خلاف زہر اگل رہا ہے، کوئی گلے میں صلیب ڈالے ہوئے تعلیمِ دینی کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مذاہب دنیا کے لئے مصیبت ہیں، اس لئے صرف عقل کے کہنے پر عمل کرو، پھر کوئی خطیب ایسا نہیں جس کی گرد سننے والوں کا ہجوم نہ ہو اور اس کے لکچر پر رائے زنی نہ ہو رہی ہو۔ پھر پولیس دیکھ رہی ہے، آجا رہی ہے، کھڑے ہوکر ان تمام مواعظ و خطبات کو سنتی ہے، لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ پیدا ہو تو پھر ادنیٰ سا اشارہ اُسکے

ہاتھ کا سارے خطرات کو دور کردیتا ہے اور مجمع اس کی ایک سیٹی سے منتشر ہو جاتا ہے

تنظیم عمل اس سے زیادہ محبوب چیز اہل انگلستان کے لئے اور کوئی نہیں۔ گھر کی معیشت میں، گھر سے باہر کی زندگی میں مشاغل معاش میں اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں الغرض ہر جگہ اور ہر وقت تم ان کے اندر ایک تنظیم عمل پاؤ گے، ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت پر کام کی پابندی یہ اُن کے نظام عمل کی روح ہے جس سے کبھی کوئی انگریز بیگانہ نظر نہیں آسکتا۔

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کے قریب جہاں دو تین سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم ہوا اور انھوں نے صف بنالی، پھر ہر نیا آنیوالا اسی صف کے آخر میں شامل ہوتا جائیگا اور کبھی وہ اس کی کوشش نہ کریگا کہ اچک کر یا گھس پل کر پہلے ٹکٹ حاصل کرے، اُن کی ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خلاف اصول کیونکر کوئی چل سکتا ہے۔

چوراہوں پر پولیس والے نے ہاتھ اٹھایا اور مسافروں، گاڑیوں اور موٹروں کا سیلاب دفعتہً رک گیا، اُس نے ہاتھ نیچے کیا اور پھر اسی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ سب چل پڑے ایسا عجیب وغریب منظر ہوتا ہے کہ بے اختیار داد منہ سے نکل جاتی ہے۔ باوجود شدید ازدحام اور کثرت آمد ورفت کے وہاں نہ کوئی ہنگامہ نظر آتا ہے نہ کوئی شور وغل، ہر کام سکون کے ساتھ ہو رہا ہے، ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور یہ سب نتیجہ ہے انتظام معیشت کا اور فرض شناسی کا، ایک مشرقی انسان کی طرح نہ اُن کے ہاں کاہلی کی دیر ہے نہ گھبراہٹ کی جلدی۔ تم اگر کسی ضرورت سے ڈاکخانہ میں جاؤ گے تو وہاں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہجاؤ گے اور تم کو یقین ہو جائیگا کہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، لیکن اگر تم صبر کے ساتھ صف میں شامل ہو گئے تو پھر دیکھو گے کہ چند منٹ کے اندر تم سے آگے کا ہجوم چھنٹ گیا ہے اور تمہارے بعد اس سے زیادہ لمبی قطار آدمیوں کی بن گئی ہے۔ وہاں یہ رات دن کا مشغلہ ہے۔ اور ہر شخص اس مکانکی زندگی کا عادی ہے۔

تم کسی بڑے مخزن (اسٹور ہاوس) یا تجارتی ذخیرہ کی دوکان میں پہونچ جاؤ اور وہاں کے انہماک کو دیکھو۔ تم یہ معلوم کرکے حیران رہجاؤ گے کہ ایک دن میں وہاں ۴ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہاں دروازہ سے داخل ہوتے ہی تم کو مختلف تختیاں لگی ہوئی نظر آئنگی جو مختلف سمتوں کا حال بتاتی ہیں اور ہر سمت میں مختلف قسم کے مال کے ذخیروں کا پتہ بتاتی ہیں پھر تم ذرا آگے بڑھے کہ وہاں کے خوش سلیقہ ملازم (مرد عورت) شگفتہ روئی کے ساتھ آئے اور تمہاری ضروریات کے متعلق تمام آسانیاں بہم پہونچائیں۔

ٹیلیفون سڑک پر ہر ہر جگہ تم کو ملیں گے اور فوراً تم کو اس مکان کے نمبر سے ملا دیں گے جہاں سے تم گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ زمین کے اوپر نیچے یہاں ریل کا ایسا ہی جال ہے جیسے جسم انسان میں شرائین و ورید لیکن ہر گاڑی میں تمام تفصیلی نقشے متعدد اشارات وہدایات موجود رہتی ہیں جس سے ایک شخص بہ آسانی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے، پھر یوں بھی اُن نقشوں کے دیکھنے کی ضرورت کس کو ہوتی ہے۔ ریل کے ملازم خود تمہاری مدد کرنے کے لئے ہر وقت ہر جگہ غلاموں کی طرح موجود رہتے ہیں۔

انگلستان کا باشندہ اپنے قوا کو کبھی بیکار و معطل نہیں رہنے دیتا اور پوری ہمت کے ساتھ وہ ان سے کام لیتا ہے۔ اور یہی نظام عمل ہے کہ وہ حفظ نشاط کے لئے کافی آرام بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ ابتدائی مدارس سے لیکر بڑی بڑی

کالجوں تک یہ دستور ہے کہ ۹ بجے صبح سے قبل وہاں تعلیم شروع نہیں ہوتی۔ اور کارخانے والے مجبور ہیں کہ اتوار اور نصف دن سنیچر کا تعطیل کے لئے وقف کردیں۔ اسی طرح ہر طبقہ کے لوگ سالانہ تعطیل چند دن کی نہایت لطف سے مناتے ہیں جس میں مالک و مخدوم سب برابر ہیں ایک خاتون میری دوست ہیں جن کے ایک چھوٹا بچہ ہے اور خود ہی ان کو گھر کا سارا انتظام اور بچہ کی نگرانی کرنی پڑتی ہے، لیکن اتوار کے دن وہ خود بھی تعطیل مناتی ہیں اور ایک دن کے لئے کسی عورت کی خدمات حاصل کرلیتی ہیں اس راحت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعطیل کے بعد لوگ نہایت نشاط اور تازہ قوت کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اور ان کو کوئی تکان نہیں ہوتی۔

ریاضت یہاں کی زندگی کا سب سے نمایاں منظر اُن کا شوق ریاضت ہے انگلستان کا ہر باشندہ مرد ہو یا عورت دیگر ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ ریاضت کو بھی ضروری جانتا ہے اور کسی نہ کسی ریاضت کے کلب کا ممبر ہے۔ میں نے سانٹ پول کالج میں لڑکیوں کو ایسی ایسی ریاضت کرتے دیکھا کہ کبھی میں خیال بھی نہیں کرسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لڑکیاں صحیح و توانا، خوبصورت، اور مستعد ہوتی ہیں۔ لندن اور اس کے قرب وجوار میں اس قدر کثرت سے اور اتنے بڑے بڑے میدان ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اُن میں آسکتے ہیں۔ اور روزانہ یہاں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی میدان ایسا نہ ہوگا جہاں تمہیں لوگوں کا ہجوم نظر نہ آئے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ اس کا لطف نہ اُٹھائیں۔ چنانچہ جب کیمرج اور آکسفورڈ کے درمیان کوئی مقابلۂ ریاضت ہوتا ہے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے سینہ یا موٹر پر کیمبرج یا اکسفورڈ میں سے کسی کا نشان نہ لگائے ہوئے ہو۔ پھر یہ نہیں کہ اس مقابلۂ ریاضت کا نتیجہ بد دلی یا رنج و ملال میں ظاہر ہوتا ہو، بلکہ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کوئی تنغص پیدا نہیں ہونے دیتے۔ پھر اسی کے ساتھ ایک بڑی جماعت بازی لگانے والوں کی ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس قدر کثرت ہے کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے تو بھی آدمی بازی لگانے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ گھوڑ دوڑ یا دوسرے کھیل تماشوں کا کیا ذکر ہے۔

تفریح چونکہ یہ قوم اس قدر نشاط طلب ہے اس لئے فطرت نے ان کے ملک کو بھی ویسا ہی خوشنما اور دلچسپ بنایا ہے یہاں باغوں اور تفریح گاہوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ہر شخص نہایت آسانی سے ہر جگہ کارخانہ کی منہمک زندگی سے نکل کر ان میں پہونچ سکتا ہے۔ یہاں کا بڑا پارک ۴۰۰ ایکڑ زمین کو محیط ہے جس میں گھاس سے سرسبز تختے، شاداب درخت، فوارے، خوبصورت پھول اور ہر وہ چیز جو روح کو راحت پہونچا سکتی ہے یہاں اور تمام پارکوں میں پائی جاتی ہے، تالابوں کی بھی اتنی ہی کثرت ہے جسمیں طیور آبی اور کشتیوں کی تعداد غالباً برابر ہی رہتی ہے۔ یہاں کی چڑیاں اس قدر مانوس ہوگئی ہیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ سے اپنی غذا آکر لے لیتی ہیں۔

پھر اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھوگے کہ اگر ایک طرف باغ یا پارک، سبزہ، تالاب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے، تو دوسری طرف ریاضت گاہیں کھیل کود کے میدان اور سنیما و تھیٹر وغیرہ بھی ویسے ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں چنانچہ تم یہ سنکر غالباً حیرت کروگے کہ یہاں ہر ہفتہ ۱۵ ملین (ڈیڑھ کرور) آدمی سنیما میں جاتے ہیں اور یہی حال تھیٹروں کا ہے۔ بعض بعض تھیٹر ایسے ہیں جن کا ٹکٹ

تم کو آج درخواست کرنے پر ایک ہفتہ کے بعد ملیگا، گویا ایک ایک ہفتہ پہلے سے لوگ اپنی جگہ مخصوص کرالیتے ہیں یہی حال رقص ونغمہ کے شوق کا ہے کہ وہاں کی تمام رقص گاہیں آدمیوں سے بھرجاتی ہیں اور روزانہ نئے نئے طریقے رقص کے ایجاد ہوتے رہتے ہیں، پھر یہاں ہر جگہ لاسلکی کا بھی انتظام ہے جس سے ہر شخص اپنے گھر بیٹھے گانا سن سکتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر کثیر مصرف کے وہ اتنا روپیہ بھی بچالیتے ہیں کہ جاکر دوسرے ملکوں کی سیر کریں۔

انگریز جس طرح اپنی خانگی زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسی طرح وہ باہر کی زندگی کا بھی شیدا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی روشن دن گزر جائے اور اس سے لطف نہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ گزشتہ عید فصح کے دن مضافات لندن میں جانے والوں کی تعداد ۴ ملین تھی اور یہ بھی اُن کی جو گھوڑے گاڑیوں کے ذریعہ سے گئے، ریل، ٹرام وے اور موٹر سے جانیوالے ان کے علاوہ تھے صرف واٹرلو اسٹیشن پر جہاں ۲۴ پلیٹ فارم ہیں، ہجوم کی یہ حالت تھی کہ دو میل کے طول میں انسانی صف قائم تھی جتنا حصہ آگے کا ختم ہوجاتا تھا اخیر میں بھر اتنے ہی آدمی بڑھ جاتے تھے یہاں تک کہ کامل ۲۴ گھنٹے یہ دو میل کی صف قائم رہی۔

خاموش وطنیت

انگلستان کے وطنی مظاہر اس قدر خاموش ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوجاتی ہے۔ جس دن یہاں عام ہڑتال ہوتی ہے، اور ہر کام کرنے والے نے اپنا کام ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ ذرائع آمد و رفت بھی تمام وہ ہوگئے تھے، وہ دن عجیب و غریب تھا کہ باوجود اتنی زبردست تحریک عمل کے شور و ہنگامہ کا کہیں نام تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے لندن پر سوگ طاری ہے اور ہر جگہ خاموش ماتم بپا ہے۔

خانگی زندگی

انگلستان کا عائلہ یا خاندان ہمارے یہاں کے عائلہ سے مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ خاندان کے افراد یہاں باہم ربط تو رکھتے ہیں لیکن ایک نہیں ہوجاتے۔ میاں بیوی رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں، خانگی زندگی کو دونوں ایک دوسرے کی مدد سے بسر کررہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا پابند نہیں ہے جس طرح مرد کام کرنے کے بعد باہر کلب وغیرہ میں تفریح کا مجاز ہے، اسیطرح عورت بھی آزاد ہے اور مرد کو اس سے بازپرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے گھر کی سیادت مشرق کی طرح یہاں بھی ماں ہی کے سپرد ہے۔

جب تک بچہ چھوٹا رہتا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ماں رہتی ہے، اور جوان ہونے کے بعد اس کو اپنا گھر علیحدہ بنانا پڑتا ہے اور والدین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بچوں کی محبت

انگلستان میں عید میلاد انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔ اور سارا لندن بالکل نئی چیز ہوجاتا ہے، زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس دن ہر چہرہ متبسم نظر آتا ہے۔ یہ عید بچوں سے متعلق ہے۔ اس لئے ماں باپ کی ساری مسرتیں اس دن سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔ بچوں کو تحفے دیے جاتے ہیں اور تمام دوکانیں لاکھوں قسم کے کھلونوں اور خوبصورت کتابوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تھیٹر اور سنیما میں بھی مخصوص طور پر وہی کھیل ہوتے ہیں جن کا تعلق اس عید سے ہو۔ چونکہ یہاں بچوں کی حفاظت، تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہے اس لئے غریبوں کے بچے بھی

ان نعمتوں سے محروم نہیں رہتے اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ کسی باپ نے اپنے بچہ کو سخت جسمانی سزا دی تو اس کو چھ مہینے کی قید بامشقت اٹھانا پڑی۔

یہاں بچہ کی صحت و تربیت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ گاڑیوں میں بٹھا کر باغوں میں لیجانا، کھیل کود کی جگہوں میں پہونچانا، روز کا مشغلہ ہے۔ بچوں کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبار بھی خاص طور سے شائع ہوتے ہیں اور نہایت کثرت سے۔ بڑے بڑے اخباروں میں بھی بچوں کے صفحات جن میں عمدہ عمدہ تصویریں ہوتی ہیں بچوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ روزانہ جو لاسلکی پروگرام موسیقی کا شائع ہوتا ہے اس میں ایک حصہ گانے یا قصہ کہانی وغیرہ کا بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے۔

پہلے سال کے بعد سے بچوں کے سامنے تصویر دار کتابیں ڈالدی جاتی ہیں، لڑکوں کے لئے علیحدہ اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ اور ہر سال ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بچوں کی صفائی و ستھرائی کا ان کے ہاں بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ غریب سے غریب شخص کے ہاں بھی روزانہ بچہ کو غسل دینا ان کی معاشرت میں داخل ہے۔ تربیت کے لحاظ سے دو چیزوں کا درس سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔ استقلال شخصی اور احترام غیر اور اسی اصول پر اس کی تعلیم و تربیت میں تدریجی ترقی پیدا کی جاتی ہے۔ پہلے بچہ کو چلنا سکھایا جاتا ہے، پھر کھیل کود، پھر اپنے لئے ضروری چیزوں کی خریداری، اور پھر مدرسہ اور وہاں کی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر عملی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے ایسی انجمنیں ہیں جو ماؤں کو بچوں کے طریق تعلیم و تربیت کا درس مفت دیتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ ان کو نہایت شدید محبت ہوتی ہے، راستہ میں، ریل میں، دوکان میں، باغ میں، الغرض کہیں کسی کا بچہ نظر آجائے وہ اس سے التفات کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایک بار میں پکاڈلی کے قریب تھی۔ اور میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ تھی، جہاں ہجوم و ازدحام کا وہ عالم کہ ایک انسان اس کو دیکھ کر آسانی سے حشر کا مفہوم جان سکتا ہے۔ لیکن باوجود اس ہنگامہ کے جو شخص میرے پاس سے گزرتا تھا، بچی (میری چھوٹی بہن) کو ضرور پیار کر لیتا تھا۔

عہدِ شباب سب سے پہلی وہ خصوصیت جو ایک انگلستان کی نوجوان لڑکی کو مرکز توجہ بنا دیتی ہے، اس کا شاندار متناسب قد و قامت ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ملبوس جو پنڈلیوں کو عریاں رکھ کر جمال قامت میں رعنائی کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک انگریز لڑکی کا حسن و جمال کسی کی توجہ کو مائل نہ کر سکے، لیکن اس کے چہرہ کی زندہ تازگی ممکن نہیں کہ نگاہ کو اپنی طرف نہ کھینچ لے۔ یہ تو اس کا خارجی پہلو ہے۔ معنوی یا عملی پہلو کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ عجیب چیز ہے۔ صبح ہوئی اور اپنے کام میں تیزی سے لگ گئی۔ تم اسے کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس قدر جلد، اور سبک طریقہ سے کہ معلوم ہوگا کوئی تیتری ہے۔ انگلستان کی عورت درس و تدریس کی جگہ ایک بہترین مدرس، دہاوی ہے، تجارتی کارخانوں میں نہایت ماہر منتظمہ ہے، اسٹیج پر بہترین رقاصہ و مغنیہ ہے اور پارلیمنٹ میں زبردست خطیب ہے۔

میں نے ایک عورت کو دیکھا جو بڑا خاندان رکھتی ہے اور اپنے شوہر، اپنی اولاد اور مہمانوں کی تمام راحتوں کی کفیل ہے۔
لیکن اسی کو میں نے کھیل کود میں مردوں سے بازیاں جیتتے، گھوڑدوڑ میں گھوڑے دوڑاتے، دریا میں کشتی چلاتے، خشکی میں موٹر چلاتے، غباروں میں اڑتے، پانی میں تیرتے، ساحل پر ریت میں لوٹتے، رقص گاہوں میں بہترین لباس کے ساتھ رقص کرتے اور سیاسی مجالس میں فصیح ترین تقریر کرتے بھی سنا اور میں حیران رہ گئی کہ اس جامعیت کا کیا ٹھکانا ہے۔
یہاں عورت کی تعلیم بھی بالکل مردوں کی طرح مکمل ہوتی ہے اور دوسرے ممالک میں بھی مخصوص فنون حاصل کرنے کیلئے جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخر کار انتخاب ان کو مل گیا اور اب اس وقت ۱۲۶۹۷۷۹۹ مردوں کے مقابلہ میں ۲۲۹۲۹۸۳۴ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔

کریم النفسی اور تہذیب انگلستان جانے کے بعد سب سے پہلے جو لفظ میں نے سنا وہ (Londoner) تھا اس کا استعمال یہاں کے لوگ بار بار کرتے ہیں، جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا جمالی پہلو ہی اُن کے سامنے رہتا ہے اور مشکل سے کبھی لفظ (nasty) اُن کے منہ سے سننے میں آئے گا جو اول الذکر لفظ کا بالکل ضد ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں نقائص بھی ہیں اور برائیاں بھی لیکن کریم النفسی کی مثالیں ان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔
وطن پرستی، مفاد قومی، تعاون باہمی، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخص کی کریم النفسی پر دلالت کرتی ہیں اور یہاں کی آبادی کا غالب حصہ (مرد عورت دونوں کا) ان صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ یہاں کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوکان میں مال بیچنے والا، اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا پہلے شکریہ ادا کرے گا اور پھر مال یا ٹکٹ دیگا۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ نوکر کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور ایک افسر اپنے ماتحت کی خدمت کا بھی اعتراف شکریہ سے کرتا ہے۔
دوسروں کی خدمت و امداد کے لئے یہاں کے لوگ ہر وقت طیار رہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رشمونڈ پارک میں ٹہل رہی تھی اور میری چھوٹی بہن جو بیمار تھی میرے بھائی کی گود میں تھی جس کو وہ بہت دیر سے لئے ہوئے تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مرد بزرگ بھی جس کی عمر ۶۰ سال کی ہوگی مع اپنی بیوی کے ٹہل رہا تھا۔ صورت و لباس سے یہ لوگ بہت معزز معلوم ہوتے تھے میرے بھائی نے تھک کر چاہا کہ بچی کو گود سے اُتار دے، لیکن وہ اسے زمین تک نہ لایا ہوگا کہ اسی مرد ضعیف نے اپنی چھڑی اپنی بیوی کو دی اور بڑھکر آگے آیا اور بولا کہ "اب اس بچی کو گود میں لے کر چلنے کی باری میری ہے"۔ جانوروں کے ساتھ بھی یہاں اسی لطف و رحم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دو سال انگلستان میں رہی لیکن اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جو دل کو بُرا لگتا۔
میں روزانہ صبح کو ریل میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کے لئے سفر کے لئے نکل جاتی، تاکہ میں یہاں کے لوگوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں۔
ریل میں ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں کے مرد عورت ریل میں بھی اپنا وقت ضائع کریں جسکو دیکھئے یا تو وہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتا ہوا ملیگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا یہی حال عورتوں کا ہے۔
ایک دودھ بیچنے والا نکلتا ہے اور ہر دروازہ پر دودھ کی بوتلیں رکھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نہ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اور نہ چوری

کا اندیشہ اُس کو ہوتا ہے۔ راستہ میں میز کے اوپر اخبار رکھے ہوئے ہیں، لوگ گزرتے ہیں قیمت وہیں رکھدیتے ہیں اور اخبار لیکر چلے جاتے ہیں پھر یہ دیانت و امانت پولیس یا قانون کے خوف سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اُن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان ایسی سخیف و ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف ان کی اعلیٰ تربیت ذہنی کا۔ برنارڈ شاہ کہتا ہے کہ "مدنیت نام ہے اسکا کہ تم میرا اور میری خصوصیات کا احترام کرو، میں تمہارا اور تمہاری خصوصیات کا احترام کرونگا" حقیقت یہ ہے کہ اہل انگلستان نے اس کو پوری طرح سمجھا اور نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے ملک کے اندر اسپر عمل کر رہے ہیں۔

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

(۲)

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند، کرۂ زمین کی گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو حب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آ رہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آ گیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین، جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آ رہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہونچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے میں نہیں کہتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخرکار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہونچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو، کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں ——— زمین کے سمندر بہہ کر نیچے کی طرف آ سکتے ہیں ——— تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہونچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہونچ سکتی ہیں لیکن کس عالم میں اس کا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"

خاتون۔ "یہ کیونکر"

کپتان: وجہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلہ نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہونچ جائے اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلہ ہی طرح چاند کی طرف کھنچا جارہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طایر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے وہاں پہونچ جا دیں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ ٹپک دیا جائے"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکہ کے ساتھ رک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکہ کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو کپتان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور میں نے اندازہ اسی کشش پیما سے کیا تھا جو زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اب میں نے گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے۔ اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو"

کپتان نے اس واقعہ پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکہ سے کسی کو ایذا پہونچی ہو تو معاف کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا سمت کی تعیئن چونکہ فضاء بسیط میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روز انہ اور اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں، پھر چونکہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جا کر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن پہلے ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا، یہی حال مشروبات کا تھا، اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علحدہ کر کے رکھدی گئی تھیں، پھیپھڑا

ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہو گئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کر کے خون میں ملجاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "اثری عضو" ہو کر رہ گیا۔

سردی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جاتی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوتی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھکر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔

گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہو گیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہونچتا ہے، اور ادائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن و منور عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

اس ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعتہً نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں

غبارے جو یکسر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔
کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہونچ گیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں اس کے چہرہ سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کرکے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور بمشکل سے نیند آئی۔
دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Shooting Stars) تھے۔ نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہوگیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی، جہاز کے عرشہ پر آکر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہوگئے ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے بہت سے ٹکڑے کرکے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کردئے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھ لئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدئے جائیں گے۔
یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔
سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ بڑھ گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کرسکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرورات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لیکر باہر پھینکدیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن اُن کی اور میری

حیرت کی حد نہ رہی جب اس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں، باہر پھینکدیں اور اس تماشہ کا لطف اُٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کرکے ٹوپی کو پھر اندر کھینچ لیا۔ بس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینکدیا اور کپتان نے پھر اُسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ شغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہوکر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف ۲ گھنٹے کا تھا اور اس خیال سے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کردیا۔ بجلی کی روشنی ہوگئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص طیار ہوگیا اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفعتہً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھکر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں۔ جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہونچنے والے ہیں، کیونکہ اونچے اونچے پہاڑ بڑے بڑے دریا وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہمکو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جا رہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی و پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اترا جسے وہاں کی زبان میں عوشان یعنی تختہ گل کہتے ہیں۔

باقی ——— باقی

نیاز

رشتہ کی ضرورت

فردوسِ محبت

اے کاش ! کھلیں آنکھیں گہوارۂ عشرت میں
اے کاش ! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش !! پہونچ جاؤں کاشانۂ راحت میں

اے راہ نما لے چل
فردوس محبت میں

خوابیدۂ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورش گہ ہستی سے بیزار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں

اے خضر وفا لے چل
فردوس محبت میں

ہے مشغلۂ دنیا توہین وفا داری
ہر ذرۂ ہستی ہے تصویر دلآزاری
انسان رہے کب تک محو غم خودداری

اے مرد خدا لے چل
فردوس محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدائیں ہیں
غم ریز ہیں نظارے خوں بار خلائیں ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضائیں ہیں

اے شمع ہدیٰ لے چل
فردوس محبت میں

اب شمع کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی ہے
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

اللہ کے گھر کی بھی تو قیر نہیں باقی

اے میری دعا لیچل

فردوس محبت میں

اس جنت زریں میں انوار کے چشمے ہیں
آرام کے دریا ہیں "ایکار" کے چشمے ہیں
تقدیس کی نہریں ہیں ایثار کے چشمے ہیں

اے بحر عطا لیچل

فردوس محبت میں

اس بزم کا ہر گوشہ کاشانۂ راحت ہے
اس خلد کی ہر محفل میخانۂ راحت ہے
اس خاک کا ہر ذرہ افسانۂ راحت ہے

اے خلد نما لیچل

فردوس محبت میں

اس دامن زریں میں معصوم نظارے ہیں
اس وادی رنگیں میں معصوم نظارے ہیں
اس محفل تسکیں میں معصوم نظارے ہیں

معصوم دعا لیچل

فردوس محبت میں

ہر باغ میں الفت کی نہریں مترنم ہیں
ہر نہر میں عشرت کی موجیں مترنم ہیں
ہر موج میں راحت کی لہریں مترنم ہیں

اے نغمہ سرا لیچل

فردوس محبت میں

رنگینی الفت سے گلریز ہے ہر گوشہ
فیاضی فطرت سے زرخیز ہے ہر گوشہ

ارباب محبت سے لبریز ہے ہر گوشہ
اے شوخ ادا چل
فردوس محبت میں

اُس "نور" کو راحت کی کرنوں نے بنایا ہے
اس "گیت" کو فطرت کے تاروں نے بنایا ہے
اس خلد کو الفت کے ذروں نے بنایا ہے
اے مست وفا چل
فردوس محبت میں

اس باغ کا ہر غنچہ تقدیس کا بوسہ ہے
اس ساز کا ہر نغمہ تسلیم کا سجدہ ہے
اس نور کا ہر شعلہ تسکین کی دنیا ہے
اے ہوشربا چل
فردوس محبت میں

گلیار بہاروں سے شاداب ہے ہر کیاری
انوار کی نہروں سے سیراب ہے ہر کیاری
اک کیف ہے ہر غنچہ اک خواب ہے ہر کیاری
اے روح فزا چل
فردوس محبت میں

تغیر و تبدل سے آزاد ہے وہ دنیا
مسرور ہے وہ دنیا دلشاد ہے وہ دنیا
آغوش محبت میں آباد ہے وہ دنیا
چل اے ہر خدا چل
فردوس محبت میں

روش صدیقی

موت

فطرت کا التفات کہیں! یا جفا کہیں!
انجام بود ہے کہ یہ آغاز نیست ہے!
سنتے ہیں جب عوام کی آہ و بکا کا شور
لیکن ادھر ہے فلسفیٔ حال کی پکار
خوابِ گراں سے کیوں اُسے تعبیر کیجئے؟
وابستۂ گہر نمود سے ہے بودِ زندگی
لیکن اگر "نمود" کرشمہ ہے بود کا

حیرت میں ہیں کہ موت کے منظر کو کیا کہیں!
کوئی فنا کہیں! دِرِ دادِ بقا کہیں!
جی چاہتا ہے موت کو کوسیں برا کہیں
کیوں موت کو نہ خضرِ رہِ ارتقا کہیں؟
کیوں ہم نہ اس کو پنجۂ مشکل کشا کہیں؟
پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں
کیوں موت کو نہ زیست کا اک "شعبدہ" کہیں

آنکس زندہ است و ندارد حیات را
در حیرتم چہ طور بداند ممات را

امین حزیں

غزلیات

باسط بسوانی

دونوں راہیں چھوڑ دی ہیں ہم نے مشکل دیکھکر   دیر و کعبہ کون جائے۔ وسعت دل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

کچھ تو لازم تھا خیال اک ناتواں کا دوستو   ساتھ میرا چھوڑتے۔ دو چار منزل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

غور سے دیکھا تو پایا اک جہان آرزو   مجھکو حیرت ہوگئی ہے۔ وسعت دل دیکھکر

قیس کو محل سے لیلا دیکھکر ہنستی رہی   قیس کیوں روتا رہا لیلی کا محمل دیکھکر

اشتیاق بزم عقبیٰ لیچلا سوے عدم   جب کوئی اکتا گیا۔ دنیا کی محفل دیکھکر

بے بلائے کیوں گئے ہم ان کی بزم ناز میں   بے اٹھائے کیوں اٹھے ہم رنگ محفل دیکھکر

حق بجانب تھا اگر صیاد کو ہوتی خوشی   پھول کیوں ہنسنے لگے خون عنادل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

باسط شوریدہ سر ہنستا رہا بیٹھا ہوا
اور سب روتے تھے اسکی وحشت دل دیکھکر

جگر بریلوی

کوئی برا کھے کچھ مجھکو ناگوار نہیں   کہ دل کے آگے کسی کا گناہگار نہیں

ابھی نہیں ہوئی تکمیل ضبط جوش جنوں   ٹھہر ٹھہر ابھی خلوت خیال یار نہیں

دعائے مرگ مفاجات ہے یہ دیر دہ   ہمیں زمانہ راحت کا انتظار نہیں

وہ غم تھا داغ کلیجہ میں جس سے باقی ہے   یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

نگاہ پھیر نہ مجھ سے کہ دل لرزتا ہے   بشر ہوں میں مری ہستی کا اعتبار نہیں

جو پھونک دے نہ کلیجہ نہیں وہ آتشِ گل — جو آگ بن کے نہ دل میں لگے بہار نہیں

چل اب خدا کے لئے خاکِ دشت پر لوٹیں — چمن میں اے دلِ ناداں مجھے قرار نہیں

جہاں کا شور ہے کانوں میں نقش آنکھوں میں

نہیں جگر تم ابھی محوِ انتظار نہیں

حافظ غازی پوری

مرے گریہ میں شبِ تارِ غم وہی آہ بے اثری رہی — کہ وہ شمعِ کشتۂ درد ہوں جو نہ جل سکی تو دھری رہی

مجھے دوریوں سے گلہ نہیں کہ ہوں بندۂ ستم آشنا — جو خیال ہے تو یہی ہے اب نہ وہ پہلی جلوہ گری رہی

. . . .

کوئی جلوہ بار جو ہو گیا مری کائناتِ حقیر پر — تو ازل سے تا بہ ابد مجھے وہی ایک بے خبری رہی

یہ تغیرات و حدوث کیا مرے رنگ و بو کو مٹا سکیں — ہوں وہ شاخِ گلشنِ راز میں جو خزاں میں لہلہی ہری رہی

کہوں کیا وہ خاص تھی کیفیت جو ملی جبینِ نیاز کو — وہی رازدارِ سجود تھی، وہی وجہ بے خبری رہی

نہ وہ ذوق لطفِ سحر ہے اب نہ صبوحیوں میں اثر ہے اب — وہ بہار اپنی گذر گئی کہ کٹوری گل کی بھری رہی

ترے "نورِ صاعقہ ریز" نے مجھے محوِ حسن کیا مگر — مری چشمِ حرص پسند کو وہی فکرِ کم نظری رہی

کھلے خاک غنچۂ دل مرا، کہ خزاں کا دور اب آ گیا — نہ فضا میں اگلی ہے تازگی نہ گلوں میں چاندنی رہی

نہ قرار آیا کوئی گھڑی، نہ ہوا نصیب مجھے سکوں — جو بہار آئی تھی باغ میں وہی وجہ دربدری رہی

ترے دل کی شمع بھڑک اٹھی، ہوا جل کے خاک جگر ترا

تجھے حافظِ "تپش آشنا" کبھی فکرِ چارہ گری رہی!!

اخگر رامپوری

نگاہوں سے ہوے اوجھل جو وہ پیشِ نظر ہو کر — ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر

خدا رکھے تمہاری بزم بھی طرفہ تماشا ہے — جو آتا ہے وہ رہ جاتا ہے سرتاپا نظر ہو کر

زمانہ ہر طرح اہلِ جہاں کا ساتھ دیتا ہے — کسی کا راہزن بنکر کسی کا راہبر ہو کر

حقیقت بیں نظر سے دیکھ دنیا کی ہر اک شے کو — مزہ جب ہے بنے تو حق نگر صورت نگر ہو کر

اثر سے بچ کے جلنے کی کوئی حد و نہایت بھی — رہے گا ایک دن نالہ پشیمانِ اثر ہو کر

کمالِ جذبۂ الفت اگر ہو جائیگا پیدا — رہیگی ایک دل کی دوسرے دل کو خبر ہو کر

چھپے زیرِ نقاب انکا جمالِ روئے تاباں کیا — شعاعِ حسن پردہ میں رہی کیوں پردہ در ہو کر

معلومات

زلزلہ

خدا جانے کتنے نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت ایسے ہیں جن کا صحیح علم انسان کو نہیں ہو سکا ہے اور انھیں میں سے ایک زلزلہ بھی ہے۔ زلزلہ کی حقیقت کا علم نہایت دشوار ہے کیونکہ جسوقت وہ آتا ہے تو ہر شخص اپنی جگہ بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کو اتنا اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے کہ بیٹھکر اس کے حدوث کی حقیقت پر غور کرے۔

حال ہی میں ایک پروفیسر نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان ایک ہزار زلزلوں کا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روز انہ دو زلزلوں کا اوسط پڑتا ہے۔ لیکن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان زلزلہ کی کیفیت کو اسوقت محسوس کرتا ہے جب ۱/۱۰۰ انچ کی مقدار سے زیادہ زمین میں حرکت پیدا ہو اور یہ حرکت ہر جگہ نہیں ہوتی۔

زلزلہ کی علامتیں کیا ہیں:۔

(۱) آواز۔ اول اول زمین کے نیچے توپوں کے سر ہونے کی آواز آتی ہے اور کبھی دہونسا بجنے کی

(۲) اس آواز کے ساتھ ہی یا اس کے بعد زمین میں جنبش ہوتی ہے اور کبھی یہ جنبش اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بڑے بڑے مکان گر جاتے ہیں

(۳) اسکی حرکت یا تو عمودی ہوتی ہے اوپر کی طرف سے نیچے کی جانب یا افقی ہوتی ہے ایک طرف سے دوسری طرف اور کبھی چکر دار کمانی کی طرح ہوتی ہے۔

(۴) زمین میں ہر جگہ جنبش نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی خاص مرکزی جگہ پر ہوتی ہے اور پھر چاروں طرف اس طرح پھیل جاتی ہے جیسے ساکن پانی میں ڈھیلا پھینکنے سے لہریں پیدا ہوں۔

زلزلہ کی موج کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اگر کسی چٹانی یا پتھریلی زمین میں زلزلہ آئے گا اور زلزلہ کا مرکز عمیق ہوگا تو زلزلہ کی موج کی رفتار ۱۰ میل فی منٹ ہوگی کبھی کبھی ۲۰۰ میل تک بھی پہونچ جاتی ہے اور یہ رفتار موج کی طرح چاروں طرف یکساں پھیلتی ہے۔ زلزلہ کا مشہور سبب وہ تغیرات بیان کئے جاتے ہیں جو زمین کی سطح میں ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کا چھلکا یا بالائی سطح بہت بڑی اور وزنی ہے جو مرکز زمین کی طرف کھنچتی رہتی ہے اور زمین کا اندرونی حصہ خروج حرارت کی وجہ سے ہر وقت سکڑتا رہتا ہے اس لئے اس کیفیت سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور چٹانیں پھٹ جاتی ہیں، چنانچہ جن مقامات میں پہاڑ نہیں ہیں اور زمین ریتیلی ہے وہاں زلزلہ کا اثر بہت کم یا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زلزلہ کا سبب کوہ آتش فشاں کا وجود ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کوہ آتش فشاں کی آتش افشانی خود زلزلہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی شدید آندھی بھی زلزلہ کا باعث ہوتی، چنانچہ امریکہ کے ماہر زلزلہ ٹنڈروف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بحر اوقیانوس میں سخت آندھی چلی جس سے سواحل امریکہ کو ایسی سخت ٹکریں لگیں کہ زلزلہ محسوس ہونے لگا، لیکن ایسی

مثالیں شاذونادر ہوتی ہیں۔

اگر زلزلہ کا مرکز سمندر کی گہرائی میں ساحل سے قریب ہوتا ہے تو نہایت بڑی بڑی لہریں اُٹھکر ساحل سے ٹکراتی ہیں اور تباہیاں پھیلادیتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قعرِ بحر مرکز زلزلہ کے قریب تموج میں آتا ہے اور یہ تموج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ پچاس پچاس فٹ کی بلند اور سیکڑوں میل کی لمبی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

۱۷۵۵ء میں پرتگال میں ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر سمندر میں زلزلہ پیدا ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر ساٹھ ساٹھ فیٹ کی اونچی لہریں ساحل سے آکر ٹکرانے لگیں۔ جس سے ۴۰ ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جب جاپان میں زلزلہ آیا تو اس کا مرکز بھی سمندر ہی تھا جو ساحل سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ آئرلینڈ کے ساحل پر بھی ۵ فٹ اونچی لہریں پیدا ہوگئیں۔

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں پیرو کے ساحل پر زلزلہ آیا جس کا مرکز سمندر تھا اور پانچ منٹ کے اندر عام تباہیاں پھیلا گیا۔

ڈاک کے عجائب

لندن کا محکمۂ ڈاک ریل سے صدر ڈاک خانہ تک ڈاک کے تھیلے لیجانے کے لئے زیر زمین ریل کا استعمال کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ہجوم حارج نہ ہو۔ یہ ریلیں بغیر ڈرائیور کے صرف میکانکی ذریعے سے چلتی ہیں اور روزانہ ۳۰ ہزار تھیلے پہونچاتی ہیں۔ ریل کی پٹڑی کی لمبائی ۶½ میل ہے اور ۷۰ فٹ زمین کے اندر سرنگ میں واقع ہے۔ یہ سرنگ گزشتہ جنگ کے دوران میں طیار کی گئی تھی تاکہ لندن کے عجائب خانہ کی تمام قیمتی چیزیں اس میں محفوظ کر دی جائیں اور بم کے گولے ان پر اثر نہ کریں۔

چیونٹی اور آگ

فرانس کی ایک خاتون مرگریٹ نے دریافت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں ایک خاص جماعت آگ بجھانے کے لئے بھی ہوتی ہے جہاں چیونٹیوں کے بھٹ ہوتے ہیں وہاں ایک لکڑی جلاکر خاتون مذکور نے ذرا بلند مقام پر رکھدی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک جماعت چیونٹیوں کی نکلی اور کوئی رقیق سا مادہ چھڑک چھڑک کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ ان میں بعض جلکر مر بھی گئیں یہ بھی دیکھا گیا کہ جو چیونٹیاں آگ میں گر گئی تھیں اُن میں سے بعض کو دوسری چیونٹیوں نے نکال لیا اور پھر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئیں۔

بجلی کے اشتہار

برقی روشنی کے ذریعہ سے اعلان و اشتہار کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک جزیرہ منتھان میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ۲۱ ہزار اشتہارات کیلئے تقریباً ۱۳ لاکھ برقی قمقمے استعمال کئے جاتے ہیں ایک کمپنی نے یہاں ایک ہوٹل صرف اس لئے خرید کیا کہ اس کو صرف برقی اشتہارات کیلئے کام میں لائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوگی وہ ہوٹل کی آمدنی سے زیادہ ہوگی۔

انیمیا کا علاج

انیمیا (خون کی کمی) ایک بیماری ہے جسمیں خون کی تولید کم ہوجاتی ہے اور انسان دُبلا ہوتا جاتا ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر شلنگ نے اس کا ایک عجیب و غریب اور نہایت مجرب علاج دریافت کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ مریض کو گائے کی کچی کلیجی کھلائی جائے

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اُس نے اس طرح ۹۴ مریضوں کا علاج کیا جن میں سے ۹۰ بالکل صحتیاب ہو گئے۔ باقی چار اور بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

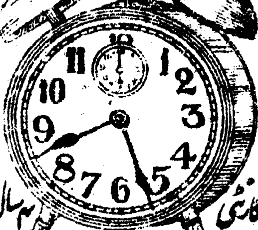
قطب جنوبی کی برف

جرمنی کے ایک پروفیسر مینارڈس کا بیان ہے کہ قطب جنوبی کے چاروں طرف جمی ہوئی برف کی مقدار اتنی زبردست ہے کہ اس سے سارے کرۂ ارض پر ۱۰۰ فٹ کی موٹی چادر بچھائی جاسکتی ہے اور اگر یہ پگھل جائے تو سمندروں کی سطح ۱۰۰ فٹ بلند ہو جائے۔ اُس کے خیال میں اس کا وزن ....۲ ٹن ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قطب شمالی کی طرف جو برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں، وہ پہاڑ نہیں ہیں بلکہ یہی منجمد برف ہے جس کی تہوں نے ایک دوسرے پر چڑھ کر پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سب سے بڑا جہاز

فرانس کی ایک کمپنی نے سال گزشتہ ایک دخانی جہاز ۴۲ ہزار ٹن وزن کا تیار کیا جو فرانس اور امریکہ کے درمیان چلتا ہے۔ ایک اور کمپنی نے ۴۶ ہزار ٹن کا جہاز بنایا جو جرمنی اور نیویارک کے درمیان سفر کرتا ہے، ہر چند یہ دونوں جہاز انگریزی جہاز مجسٹک اور برنگاریا کو نہیں پہونچتے جو ۵۶ ہزار اور ۵۲ ہزار ٹن کے ہیں لیکن یہ دونوں جہاز برطانیہ کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جرمنی کے ہیں جن پر برطانیہ قابض ہو گیا ہے۔

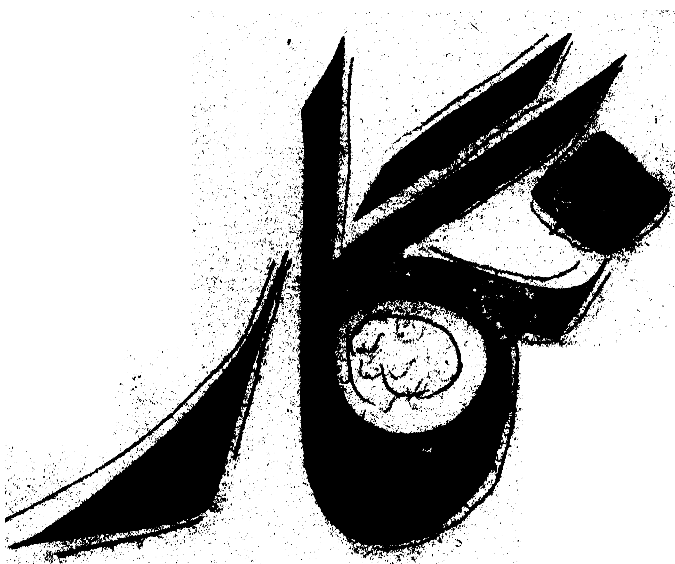
کونارڈ کمپنی نے اب ایک اور جہاز بنانا شروع کیا ہے جس کا وزن ۶۰ ہزار ٹن کا ہوگا اور اس کی لمبائی ۱۰۰۰ فٹ ہوگی اس میں ۵ ہزار مسافر آسکیں گے۔ ایک اور جہاز طیار ہو رہا ہے جو مجسٹک جہاز سے زیادہ شاندار اور تیز رفتار ہوگا اِن دونوں جہازوں کی لاگت کا اندازہ گیارہ ملین گنی (تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ) کیا جاتا ہے۔











قواعد رسالۂ نگار

۱ ۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ ۔ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ ۔ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جنپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہین
۴ ۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ ۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئن ۔
۶ ۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ۔

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو [illegible] فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب
- اردوئے معلی ۱۲ عہ
- عود ہندی عہ
- دیوان غالب ۱۰ عہ
- مکمل دیوان عہ

مولانا نذیر احمد
- نبات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظہ حسنہ ۱۳ر
- رویائے صادقہ ۱۴ر
- ایامی ۱۴ر
- فسانہ مبتلا ۱۴ر
- ابن الوقت ۱۴ر
- مصائب غدر ۱۲ر
- حمائل مترجم ۱۲ر
- الحقوق والفرائض ے

مولانا شبلی
- سیرۃ النبی جلد اول ۱۴ر
- 〃 دوم ۱۴ر
- 〃 سوم ۱۴ر
- الفاروق ۱۴ر
- سیرۃ النعمان ۱۴ر
- الغزالی ۱۴ر
- المامون ۱۴ر
- سوانح مولانا روم ۱۲ر
- سفرنامہ مصر و شام ۱۲ر
- علم الکلام ۱۲ر
- الکلام ۱۲ر
- رسائل شبلی ۱۴ر
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- 〃 دوم ۱۲ر
- 〃 سوم ۱۲ر
- 〃 چہارم ے
- 〃 پنجم ۱۲ر
- موازنہ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- کلیات فارسی ۱۲ر
- کلام شبلی اردو ۸ر

امیر مینائی
- امیر اللغات عہ
- صنم خانۂ عشق ۱۲ر
- مراۃ الغیب ۱۴ر
- محامد خاتم النبیین ۸ر
- ضیائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی ۱۲ر

رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد [illegible]
- سیر کہسار ۱۴ر
- خدائی فوجدار ۱۲ر
- جام سرشار ۱۲ر
- الف لیلیٰ بطرز ناول عہ

رجسٹرڈ نمبر ال ۱۱۰۴   جلد ۱۴ - شمار ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عہ

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر :- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | اگست ۱۹۲۸ء | شمار ۲

ملاحظات

آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ "مدرسہ و خانقاہ" کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جا رہی ہے اور موج کا رُخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کے لئے "زنجیر سلاسل، قید و بند" کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انھیں سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ موجودہ پردہ کا تشدد اک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے منافی - اس سے قبل نگار میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ :-

(۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

(۲) مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو - اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اسکی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے (جیسے ہاتھ پاؤں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی معتدل تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آج جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ برافگندہ نقاب جہاں چاہے پھرے - لیجئے قصہ ہی طے ہوا "میں و تو کی نزاع کا"۔

اس کے آگے اب مطالبہ "ہل من مزید" کے لئے صرف ایک ہی چیز رہ جاتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اگر کل کو ثریا بیگم (ملکۂ افغانستان) عریاں لباس رقص میں نمودار ہوجائیں، تو عبدالماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کردیں کہ جب چہرہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب سامنے آہی گیا، جب کسی نے ہکو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جب حسن انسانی کا وہی حصہ جو سرفتنۂ عشق و محبت" کہلاتا ہے چھپانے کی چیز نہ رہا تو پھر سینہ و شانہ کی عریانی میں کیا حرج ہے "سیم ساق" کے دیکھنے میں کیا نقصان ہے اور کپڑے چڑھائے ہوئے پائینچے اٹھائے ہوئے "سر بازار آجانے میں کیا مضائقہ ہے۔ وائے گر وا پس امروز بود فردائے

اللہ نے تو رسول کو سورۂ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ:-

یا ایھا النبی قل لازواجک و بناتک و نساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ہ

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ معمہ آج عبدالماجد صاحب کے قلم حسن رقم سے حل ہوتا ہے کہ یدنین علیھن من جلابیبھن کے معنے بے نقاب ہوجانے اور چہرہ کھولکر بازار میں بے نقاب آجانے کے ہیں۔ فریاد از تطاول شیں کنند تو!

مجھ پر وکیل ہو کر پیشۂ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا آج دنیا اس طبیب حاذق کی حذاقت کا بھی مشاہدہ کرلے دنیا کا اس قائد اعظم کا تماشہ کے اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس ماہر قرآن و حدیث کے فتاوائے دینی کو بھی دیکھ لے۔ تاکہ آئندہ وکیل و طبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس واقع ہو اور خیر و برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے سے عبدالماجد صاحب نے کھول دیا ہے اس کا طرۂ امتیاز کسی ملحد و دہریہ کو نہ حاصل ہوجائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ "اخبار ہمدرد" میں شایع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کرسکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم و فضل کے سلسلہ میں انھوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتادیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لایق ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم و فضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے انحطاط و زوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:-

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا) پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی "چہ خورد بامداد فرزندم" ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً تمکن فی الارض انھیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت و ثروت، جاہ و دولت

فراغدستی و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو "جنت عدن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ معمہ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدۂ الٰہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر دو ہی صورتیں ہیں یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکبت و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو تمکن فی الارض کے لئے اصلح تسلیم کیا جائے۔ تاریخ اجرا سے لیکر اس وقت تک "سچ" کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرایم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بھی بتاتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں کیا نقائص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

کیا کلام مجید میں "استخلاف فی الارض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے کاش کہ عبدالماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورۂ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قایم کر کے کہ:۔

فهل يهلك الا القوم الفاسقون ط

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی و ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو بہتر کہہ سکے جناب عبدالماجد کی صحافت اور انشاء کا انحصار صرف اس پر ہے کہ اہل یورپ کے معایب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیائے عمل میں اس طرز تحریر کو صرف "کوسنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اس جنس کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے عبدالماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے۔

جولائی کا مہینہ تقریباً نصف سے زاید علالت میں بسر ہو گیا، اس لئے میں کاپیوں کی صحت کی نگرانی بالکل نہیں کر سکا۔ ہر چند حالت صحت میں جب میں اس کا اہتمام کرتا تھا اسی وقت کیا کامیابی ہوتی تھی لیکن خیر کم از کم میرے دل کو تو اطمینان رہتا تھا کہ اپنے امکان میں جو کچھ تھا اس سے دریغ نہ کیا گیا۔ اس مرتبہ مجھے یہ کاذب طمانینت قلب بھی حاصل نہیں ہے

نیاز فتحپوری

قایم چاندپوری

شعرا کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد تذکروں ہی سے مل سکتی ہے لیکن ان تذکروں میں بڑا نقص یہ ہے کہ صحت اور شاعر کے ذاتی حالات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم صحت کیساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار پر اچھی طرح بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کس سنہ میں پیدا ہوا کن کن سے کسب سخن کیا، کہاں کہاں کی خاک چھانی اور بالآخر کب عالم جاودانی کی راہ لی۔ اسی وجہ سے ہم کو شاعر کے حالات ترتیب دینے میں زیادہ تر اشعار کی زبان سے مدد لینا پڑتا ہے، عام طور پر تذکروں میں پہلے تو صحیح نام ہی درج نہیں ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو مختلف تذکروں میں اس قدر زبردست اختلاف ہوتا ہے کہ کسی خاص نام کو صحیح قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے یہی حال تاریخ وفات کا بھی ہے، چنانچہ قایم کے نام کے متعلق بھی زبردست اختلاف ہے، گارسان دی تاسی نے تذکروں کے انہیں نقایص و معایب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے "اہل ایران اور ان کے تتبع میں ہندی مسلمان سوانح (اور خاصکر ہمعصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بیحد شوقین تھے، اور جیسا کہ ہمارے ہاں کا حال ہے ان میں صرف تاریخ وفات مفقود نظر آتی ہے لیکن یہ تذکرے بجائے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جزو ہیں، ان تذکروں میں مولفین، مشہور اور ملاقاتی شاعروں کی مدح سرائی دل کھول کر کرتے ہیں اور حیلہ سے انہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں، درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات ہیں جنہیں شعرا کی زندگی کے حالات پر شکوہ اور شاندار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں، بعض اوقات کئی کئی صفحوں تک چلے جاتے ہیں اور اکثر ان میں سوائے شاعر کے نام کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات مدح کے بعد دس، بیس، تیس صفحوں تک انتخابات ہوتے ہیں اور کبھی صرف دو تین شعر ہی نمونہ کے دیدئے جاتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے، تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں، یورپ میں سوانح عمری کے مولف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مصنفین یا شعرا کے ذاتی حالات تفصیل سے بیان کئے جائیں اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی صحت کا بھی بہت کم خیال کیا جاتا ہے ان شعرا کو قدیم کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے پہلے گزرے ہوں اور مولف اپنے ہمعصروں کو شعراے جدید لکھتا ہے، تاریخ اور سنہ اور خاصکر تاریخ پیدائش ان تذکروں میں شاذ و نادر ہی ہوتی ہے اسلئے اس کے اشعار کی زبان دیکھکر یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ کس زمانہ یا کس صدی کا شخص ہے لیکن اس میں بھی دشواری واقع ہوتی ہے کیونکہ کتابوں کی نقل میں بہت سے الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں" (رسالہ اردو بابتہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء)

اس شاعر کے بیان میں سب سے پہلا مختلف فیہ مسئلہ اس کے نام کا ہے، مختلف تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس کا نام شیخ محمد قیام الدین، شیخ محمد قایم اور قیام الدین علی تھا، تذکرۂ گلشن بیخار، گلستان بیخزاں، بزم سخن اور سخن شعرا اور تذکرۂ کریم الدین میں اس شاعر کا نام شیخ محمد قیام الدین مذکور ہے اور تذکرۂ میر حسن، شمع انجمن، گلشن ہند، نکات الشعرا اور طبقات الشعرا میں شیخ محمد قائم تحریر ہے۔ ان سب سے ہٹکر مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم نے تذکرہ گل رعنا میں قیام الدین علی لکھا ہے ہماری رائے میں اس شاعر کا نام در اصل شیخ محمد قیام الدین اور تخلص قائم تھا، روزمرہ کی بول چال میں چونکہ کثرت کیساتھ قایم ہی کہا جاتا تھا۔ اس لئے بعض تذکرہ نویسوں نے تخلص کے ساتھ شیخ محمد کا اضافہ کرکے اس کا نام ہی شیخ محمد قایم لکھدیا، تخلص کی شہرت نے اصل نام کو گمنامی میں ڈالدیا، چنانچہ اصلی نام کی جگہ بھی تخلص ہی نے لی،

قایم کا وطن چاندپور متعلقہ سنبھل ضلع مرادآباد تھا، والد کا نام کسی فارسی یا اردو کے تذکروں میں نہیں ملا البتہ کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مرتبہ ایتھے میں ان کے والد کا نام علی درج ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر اسپرنگر نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں "مخزن نکات" کے تحت یہ لکھا ہے کہ قایم کی خود نوشت مختصر سی سوانح عمری بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک ہے، اسمیں قایم نے اپنے والد کا نام لکھا ہو، بہر حال یہ امر متفقہ ہے کہ قایم نے ابتدائی زندگی چاندپور میں بسر کی اور اوایل عمر میں تلاش روزگار میں وطن سے روانہ ہوا اور مردم خیز خطۂ دہلی جہاں کی علم پروری کی بہت شہرت سنی تھی پہونچا، شاہ عالم بادشاہ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگیا۔ اور داروغہ اسلحہ خانہ بادشاہی مقرر ہوا، ملازمت کے تعلق سے عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا، تحصیل علم کا حال معلوم نہیں مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ ان کی انشا پردازی میں خلل واقع نہ ہوا اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانوں کے لئے عام تھا، دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی خواجہ میر درد، سودا، میر و حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جمگھٹا تھا، اور شاعری کا ہنگامہ گرم، قایم نے طبع موزوں اور ذہن رسا پایا تھا، شاعری کی طرف فطری میلان تھا، صغر سنی ہی میں تصنیف نظم کا شوق پیدا ہوا، شعر و سخن کے ہنگاموں نے طبیعت میں ایک جوش پیدا کردیا خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چندے بعد ان سے فیضیاب ہوکر مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد ہوئے اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ ان کے مرزا ادا کو دیکھکر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

آپ کی خوش بیانی و قادر الکلامی نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ آپ ایک مسلم الثبوت استاد مانے گئے، تمام تذکرہ نویس آپ کے مداح ہیں، آپ کے پاکیزہ و شیرین کلام نے استادان فن سے خراج تحسین حاصل کیا،

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"نخل حدیقۂ فصاحت و غنچۂ بستان بلاغت، شمع بزم سخندانی، چراغ نکتہ رانی، ترقی فکرش دایم شیخ محمد قایم شاعریست خوش گو شاہین طبعش تیز بال و شہباز فکرش بہ اوج کمال، خوبی اشعارش چوں حسن محبوباں دلپذیر رابطہ الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر"

مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"پختگی کلام وچستگی مصراع غزل در قصیدہ ومثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد درراہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان می جست"

مولف طبقات الشعرا رقمطراز ہے۔

"بسیار آدم بامزہ واہل درد، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، نہایت بزرگ وخوش مقال ودر فنون سخنوری باکمال، از خوشخیالان زماں وبلند نظران جہاں فکر صائب دارد ونازک خیالی ومعنی یابی داد سخنوری میدہد"

مرزا علی لطف "گلشن ہند" میں لکھتے ہیں۔

"نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف، سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے راقم آثم کو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"

شیفتہ تذکرہ گلشن بیخار میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شاعریست خوش گفتار بلند پایہ موزونیست عالی مقدار گرانمایہ وانچہ بعض ناشناسان سخن بہ مکانت سودا می شمارند حرف در دیوانگی شان از جنون است بہرحال قایم در سخن دستگاہے بلند دارد گو ہمپایہ سودا مباش، لاسیمہ در قطعات ورباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

شاعر کی حیثیت سے قایم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کئے جاتے تھے، قایم نے جیسا کہ مصحفی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نویسوں کی رائے میں ان غزل اور مثنوی سے زیادہ مناسبت تھی، قطعات ورباعیات میں وہ یگانہ خیال کئے جاتے ہیں لیکن جس طرح ہم نے اوپر بیان کیا ہے شیفتہ کی رائے میں ان کی بہترین نظمیں قطعات ورباعیات ہیں، لیکن کمال (جس نے ایک تذکرہ بنام "مجموعہ انتخاب" قایم کے دس سال بعد لکھا ہے) لکھتا ہے کہ سودا کے سوا جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے وہ سب سے بڑھا ہوا ہے، وہ قایم کا بیحد مداح ہے چنانچہ اس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرہ میں قایم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہے جیسے بیانیہ، ہجویہ اور دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قومی خصایص کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ قایم ان شعرا میں سے ایک ہے جو مصلح اور رواج دینے والے اس زبان کے تھے اور جنھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا قایم کی تعریف وتوصیف اور ستائش میں تذکرہ نویسوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی ہے جناب منشی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار ہے اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کرسکتے کیونکہ وہ شخص اس رتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اُس کی قدر کھلتی ہے بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ و بے استعداد جو اس کو برابر سودا کہنے میں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر نہیں کہہ سکتے ہیں خصوصاً قطعات و رباعیات اس کی ایسی ہیں کہ باریک بیں آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جب اس کو مطالعہ کرتے ہیں"

نکات الشعرا میں میر صاحب ارقام فرماتے ہیں،۔

"جوانے است، خیرہ طبیعت حسن پرست ، نوکر پیشہ، با فقیر نیز آشنا است"

میر صاحب کا یہ لکھنا کہ حُسن پرست تھا کچھ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت یہ روش عام تھی اور اس زمانہ کی آب وہوا ہی کچھ ایسی تھی، شاعر کے لئے حسن پرست ہونا ضروری تھا کہ اظہار جذبات و احساسات میں واقعیت کا رنگ آسکے چنانچہ درد کے متعلق بھی امرد پرستی ثابت ہے، خود میر صاحب بھی نگاہ ناز کے گھائل تھے۔ اپنے حسن وعشق کی داستان کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مشق سخن شروع کی بالآخر اسی فن میں ان کو ناموری حاصل ہوئی، امردوں پر بھی جان دیا کرتے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں اس کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

قایم نہایت متواضع اور خلیق و وضعدار تھے، طبیعت میں سوز وگداز تھا، اپنے خصائل پاکیزہ کی وجہ سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا، سخن گوئی کی وجہ سے وہ قدر ومنزلت اور شہرت حاصل کرلی کہ استادان وقت کے ہمسر خیال کئے جانے لگے، معاش کی بیفکری نے کسب سخن کا اچھا موقع دیا۔ دہلی میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں شرکت کرتے تھے، سودا۔ درد اور میر سے اچھے تعلقات تھے ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے،

دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی وطن چلے گئے چنانچہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

"سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد جب کہ وہ رشتہ جس میں تمام ملازمین منسلک تھے ٹوٹ گیا اور وہ مثل گہر آبدار ذلت وخواری کی زمین پر گر پڑے اور ہر شخص نے اس طرف کی راہ لی جہاں قدردانی کی اُمید ہوسکتی تھی تو میں مجبور ہوگیا کہ اپنی مرضی کے خلاف بجبر وکراہ نقل مقام کروں"

کچھ دنوں نواب محمد امیر کے ساتھ ٹانڈہ میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، وہاں احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کردی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے۔ روپیے اور ملکیتیں جو ضبط ہوچکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے۔

طبقۂ متوسطین کے دور اول کے شعرا میں سے ایک قایم ہیں۔ سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ روابط جنھیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے، تاہم کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح خیال کئے جاتے تھے مگر آج ہم کو اجنبی اور نا مانوس معلوم ہوتے ہیں، اس عہد کے شعرا نے دلپذیر اور دلکش و پسندیدہ محاورات اور ترکیبیں جو فارسی میں دیکھیں انھیں کہیں ترجمہ کرکے اور کہیں بجنسہٖ لے لیا اور انھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا اور دور جدید میں فارسی زبان کی ترکیبیں اردو غزل گوئی کا زیور سمجھی جاتی ہیں (تذکرہ گل رعنا) فارسی زبان میں کسی چیز کی کثرت کا بیان الفاظ کی تکرار سے کرتے ہیں، چنانچہ قایم نے کہا ہے ؎

جب موج پہ اپنی آگئیں چشم　　دریا دریا بہا گئیں چشم

آنکھوں سے جاے اشک گریں گل چمن چمن　　منظور گریہ گر ہیں ترا رنگ بو کروں

متاخرین شعرا کی فارسی کی دلاویز ترکیبیں جو شعراے دلی کے کلام کا زیور ہیں اسی دور کی یادگار ہیں، قایم نے یوں باندھا ہے۔

اے ابر اپنے گریہ میں جس وقت جوش تھا　　جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں بدوش تھا

کسکی نگاہ گرم تھی گلشن پہ اے نسیم　　شبنم سے برگ گل لب تبخالہ جوش تھا

ہر دم شرار و برق سے کیا ارض کیا سما　　ہر ایک تیرے منہ پہ تبسم فروش تھا

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جسکے بیچ　　ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے انس　　گویا کبھو یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا

قبول عذر تو واں ہو جہاں ملال بھی ہو　　بجان پاک صفایاں جو کچھ خیال بھی ہو

ترکیبوں سے گزر کر اس دور کے شعرا نے خالص فارسی طرز ادا میں بھی بعض بعض اشعار کہے ہیں، قایم نے کہا ہے

ہے خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب خراب　　غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جاے گا

اے وہ کہ تو کرے ہے ہر آزار کا علاج　　جز مرگ کچھ بھی ہے ترے بیمار کا علاج

ہے اشک بھی بنام ہر یک　　کو تجھ سے کہے مری زبانی

کو و صحرا کہ خاک پہ میرے ہو گرم شور　　تھا اک چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا

فارسی محاروں کے ترجمے اس عہد کے شعرا کے کلام میں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ قایم اس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں ؎

دل کو کیا باندھے گلزار جہاں سے بلبل　　حسن اس باغ کا اک روز خزاں ہووے گا

کچھ لکھوں سوز دل اپنے سو اسے ای قاصد　　جائے کاغذ ہوں اگر بال و پر پروانہ

تا کجا مستی ہیں ناخوش دل احباب کریں　　یکدو جام اور بھی ساقی کہ بس اغ خواب کریں

ہر طرف ظرف وضو بھرتے ہیں اعظا ہوئی صبح　　ساقی اوٹھ ہم بھی صراحی میں مئے ناب کریں

(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھے چلے آتے ہیں ان کو یہ تبدیل الفاظ و بہ تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیئے اور مزہ لیجئے، انکی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلاویز اور دلکش ہیں، علاوہ اس کے قدیم جذبات وخیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں انھوں نے پیدا کی ہیں وہ پرانے روزمرہ اور محاوروں کے بدلجانے پر بھی اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں ملاحظہ ہو۔

قایم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح　　مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد، عمر نوح　　دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا　　(تذکرۂ گل رعنا)

ان بزرگوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے مگر اعتدال کیساتھ، متاخرین کی طرح صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا ہے کہ شعر سنکر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہوجاتا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے

قایم کہتا ہے ؎　　مجھسا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں　　ہے یوں تو زلف یار بہر اس قدر نہیں

دل ڈھونڈ نا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے　　اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے　　(تذکرۂ گل رعنا)

تشبیہ و استعارہ کا موزوں و مناسب استعمال شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تشبیہ محسوس چیزوں سے دیجائے تاکہ اُن کے عوارض و اوصاف زیادہ نمایاں ہو کر نگاہ کے سامنے آئیں اور اس طرح ہر ایک چیز آنکھوں کے سامنے پھر جائے دیکھئے قایم نے سادگی کے ساتھ تشبیہ کے استعمال میں جدت و ندرت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو،

درد و غم داغ ہر اک کا ہے مجھے پاس مزاج　　جوں کوئی شخص نئے شہر کو آباد کرے

مرکب تشبیہیں بھی زیادہ نادر اور بدیع خیال کیجاتی ہیں کیونکہ دو چیزوں کے اوصاف کی مجموعی ہیئت سے ایک حالت کا نقشہ زیادہ

وضاحت اور رنگینی کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے،

موج نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ تری　　یہ ہستی دو روزہ نخل کنار جو ہے

وہ گویا زخم ہے چہرہ کے اوپر　　جو بے لطف سخن کوئی دہن ہے　　(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومعنین جو قدما کی شاعری کا مایۂ ناز ہے ان کے دور کرنے میں انھوں نے بڑی کوشش کی ایہام گوئی کو ترک کر کے شعر کو بلند مضامین اور لطیف جذبات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے جو بھولنے کے قابل نہیں، مذکورۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے علو خیالی، تاثرات قلبی، سادگی، نزاکت اور لطافت کی داد دیجئے،

لبریز شوق میرا از بسکہ مو بمو ہے　　سمجھا نہ میں یہ اب تک یہ میں ہوں یا کہ تو ہے

غنچے نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع　　گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی　　اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

بہار عمر ہے قایم کوئی دن　　اسے جوں گل بِتا رے کانٹ ہنسکر

اس دور سے پہلے شعرا ریختہ غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہیں اور قصیدے بھی برائے نام لکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو قصیدہ نہیں کہہ سکتے، دو چار شعر میں کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدے کے لوازم قرار پا گئے ہیں ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہیں بن سکتا، سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصاید دہوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہونچایا، اس سلسلہ بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصناف سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور کے بزرگوں نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا، قصیدوں میں پر شوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبیں استعمال کیں، غزلوں میں بے تکلف، زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھوں نے کی اس کی نظیر قدما کے کلام میں نہیں مل سکتی، اور جوش و خروش کلام کی گرمی، اور دلاویز و دلچسپ و دلپسند بحروں میں جن میں سے اب تک بہت سی اردو میں نہیں آتی تھیں اور پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو سودا و قایم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو کہ اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہیں پڑتا، (گل رعنا) جس طرح ہم نے پہلے لکھا ہے اس عہد کے اساتذہ قصداً سنگلاخ زمینوں میں زور طبع دکھایا کرتے تھے اور اس کو باعث سرمایہ افتخار سمجھتے تھے ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی ردیفوں کا نباہنا انہیں بزرگوں کے

دل و دماغ کا کام تھا۔ ایسی ردیفوں کو بھی اس خوبی سے نباہا کہ سررشتہ مضمون کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، چنانچہ قایم نے اس طرح طبع آزمائی کی ہے ؎

جی بھی لے، دل لیا ہی تو چل یک نشد دو شد — تا پھر وہ تازہ ہوئے مثل یک نشد دو شد
وعدہ جو کل کا آج پہ تھا سو ہوا اخلاف — پھر آج آپ کہتے ہیں کل یک نشد دو شد
کل صبر و طاقت اسکی گلی میں ہوئے تھے گم — خالی ہے آج دل سے بغل یک نشد دو شد

مسابقت یا ایک کا دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جد و جہد کرنا عموماً عمدہ نتائج پیدا کرتا ہے، جولانی طبع دکھانے کا موقع ملتا ہے محنت و کاوش، دماغ سوزی اشتداد فکر و غور و تدقیق، جستجو و تلاش اور معنی آفرینی کی کوشش کرنا پڑتی ہے، چنانچہ شعرا کی ہمعصرانہ چشمک سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ زبان ثقیل الفاظ اور فارسی الفاظ کے بیجا استعمال سے آزاد ہو کر نہایت صاف اور شستہ اور مقبول عام ہوگئی، زبان کی اسی شستگی و پاکیزگی نے اس دور میں مثنوی کو اعلیٰ پیمانہ پر پہونچا دیا، چنانچہ مصحفی، میر حسن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"بعد ازاں کہ دور مرزا رفیع سودا شد و زبان ریختہ چنانچہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بحکم قوت
ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم رسانده مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی و میاں
محمد قایم گزاشتہ کلام خود را بمرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوان ضخیم و مثنوی ہاے متعددہ
در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام داد ید بیضا نمودہ الحق کہ کار کار اوست قطع نظر
از بلاغت شاعری زبانش بسیار پر مزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ"

اسلئے اردو شاعری نے جو اب تک فارسی شاعری کے مقابلہ میں کم درجہ اور اہل کمال کی شان کے خلاف سمجھی جاتی تھی ایک ممتاز حیثیت اختیار کرلی، اور اس دور کے شعرا اُسکو خود فارسی شاعری کا حریف مقابل سمجھنے لگے، چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

قایم جو کہے ہیں فارسی یار — اس سے تو ریختہ ہے بہتر

فارسی کہنے پر افتادہ ہوگئی قایم — رفتہ رفتہ جو ترے شعر صفاہان گئے

محمد شاہی دور تک اگرچہ دلی میں اردو شاعری کا عام رواج ہو چکا تھا تاہم شاعری کا جو انداز تھا وہ بہت کچھ ترمیم و اصلاح کا محتاج تھا، آبرو، حاتم اس طبقہ میں شامل ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کو مستقل فن بنالیا تھا مگر اس صنعت کی پابندی نے اُنکے کلام کو سبک بنا دیا تھا، اس لئے اس دور کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا تو مرزا مظہر جانجاناں خواجہ میر درد، فقیر دہلوی، مرزا سودا، میر تقی میر، قایم اور میر حسن جیسے مصلحین فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی، اور ایک مستقل دور جدید و اصلاح کی بنیاد ڈالی چنانچہ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں،

"می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلی شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مرد یست فرشتہ صفت"

چنانچہ اساتذہ نے غزل کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اردو شاعری کے عیوب مٹا دیئے ان کو اپنی اس خدمت پر بڑا ناز تھا۔ قایم نے اس طرح تعلی کی ہے۔

قایم میں ریختہ کو دیا خلعت قبول ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

قایم نے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف شاعرانہ تعلی ہے اُسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اردو زبان کا اصلی وطن دکن ہے جہاں تک تحقیقات بتاتی ہیں اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند کے شاعروں میں حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور اس طرز کو اپنی نظموں کے لئے اختیار کیا، اس سے قبل تک وہاں فارسی مستعمل تھی، اس کے برخلاف دکن میں ہم سولھویں صدی عیسوی و سترھویں عیسوی کی ابتدا میں بہت سے نامور شعرا کے نام پاتے ہیں، مثلاً شاہان گولکنڈہ، محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن تانا شاہ، انوری، ابن نشاطی، افضل، غواصی، رستمی، نصرتی اور ولی وغیرہ شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، چنانچہ گارسان دی تاسی لکھتا ہے "حاتم جو سترھویں صدی کے آخر میں ہوا، دہلی کا غالباً پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں لکھنا شروع کیا، اور اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے عام زبان (اردو) میں لکھنے کا اسوقت فیصلہ کیا جب کہ ولی کا دیوان دہلی پہونچا اور پھر (شمال کے) دیگر شعرا نے اس کی تقلید کی" مولوی سید امداد امام صاحب اثر کاشف الحقایق جلد دوم میں لکھتے ہیں "جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اردو نے اپنے مولد سے جلاوطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا، ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہونچا، یہ سنہ محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا، شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی، شاہ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گزرے ہیں" یہ صحیح ہے کہ اس دور سے پہلے تک اردو زبان میں سنسکرت، بھاشا، اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے اور عربی و فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی چنانچہ سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو پاک و صاف اور شستہ بنانا چاہا اور اس کے بعد شعرائے مصلحین" نے اس ابتدائی اصلاح کی تکمیل میں بڑا حصہ لیا، لیکن اس کے یہ ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ جو زبان ان سے تقریباً سو دو سو سال بیشتر سے دکن میں مروج تھی "لچر" قرار دیجائے، عام قاعدہ ہے کہ ہر زبان کی ابتدائی حالت کسمپرسی کے عالم میں ہی زبانوں کی سرگزشت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کہ ارتقائی منازل طے کر کے مصلحین کی رہین منت نہ بنیں انھوں نے موجودہ اصلاح یافتہ زبان کی شکل نہ اختیار کی، انگریزی زبان پہلے

غور کیجئے کیا چوسر، وکلف اور بن جانسن وغیرہ کے وقت کی زبان اب رائج ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ میر، سودا و قائم نے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا اور اصلاح یافتہ زبان کا اپنے آپ کو موجد ثابت کیا ہے کیا ان کی اصلاح شدہ زبان اب زمانۂ حال میں رائج ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، بہت سے الفاظ اور محاورات جو اس وقت معنی خیز اور مناسب و موزوں سمجھے جاتے تھے اب متروک ہو چکے ہیں، ممکن ہے کہ ایک سو سال بعد زبان اور بھی ترقی کر جائے۔ فنون کی اصطلاحات کا جو قحط الرجال تھا وہ اظہر من الشمس ہے، دار الترجمہ حیدرآباد نے زبان کو سائنٹفک اور فنی اصطلاحات سے مالا مال کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جسطرح ہمنے پہلے لکھا ہے ایک سو سال بعد زبان کا اور ہی کچھ رنگ ہو جائیگا کیا اس وقت حیدرآبادی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ میر و سودا و قائم کی اصلاح کردہ زبان بالکل "لچر" تھی اور دراصل زبان جدید کے موجد ہم ہیں؟

جسطرح ہمنے اوپر لکھا ہے محمد شاہی دور کی مشہور خصوصیت ایہام گوئی تھی جس کی مظہر وغیرہ نے سختی کیساتھ مخالفت کی اور اس دور کے تمام اساتذہ نے اس داغ سے اپنے کلام پاک کیا حتیٰ کہ شاہ حاتم نے بھی اس طرز کو ترک کیا، قایم اسی ایہام گوئی کے متعلق کہتے ہیں۔

ہو ورم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چین یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرشام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

وہ شعرا جو پہلے اس رنگ میں کہتے تھے انھوں نے بھی اپنی روش بدل دی اور اسی جدید طرز میں لکھنے لگے، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ اصلاح زبان کا تھا کیونکہ قدما کے پہلے دور تک سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے، اور فارسی و عربی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی، لیکن اس دور میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو دہلی کے محاورے کے مطابق بنانا چاہا مگر اس اصلاح کی تکمیل میر و مرزا اور درد و قائم نے کی، ان بزرگوں نے قدیم محاورات و الفاظ میں تغیرات پیدا کئے، ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی، اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی طرز میں کہنا شروع کیا، جن لوگوں کی طبیعت کو مضمون آفرینی سے مناسبت تھی انھوں نے ناصر علی، جلال، اسیر و کلیم و بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی، چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں قایم کی نسبت لکھتے ہیں۔

"طرزش بطرز طالب آملی مانند"

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہمارے شعرا نے فارسی کی طرز ہی کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ ان کے کلام کو پیش نظر رکھکر شاعری شروع کی، چنانچہ بعض نے شعرائے فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور مقطع میں ان کا پورا مصرع نقل کر دیا، بعض نے انہیں ردیف و قافیہ میں غزلیں کہیں بعض نے اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ترجمہ کیا اور یہ بات اس وقت نہایت عمدہ سمجھی جاتی تھی کہ اردو شاعری کو فارسی کی تازگی نیائی

مضمون آفرینی اور لطیف جذبات سے مالا مال کر دیا جائے۔

نظیری کا ایک شعر ہے ؎

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بہ حرف　　نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

قایم نے اس کا بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے ؎

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے　　دیکھا تو کہیں اس میں تیرا نام نہ پایا　　(شعر الہند جلد اول)

جدید تعلیم یافتہ گروہ کا یہ اصلاحی مطالبہ ہے کہ اردو زبان کی غزلوں میں عموماً بسیط خیالات ادا نہیں کئے جاتے ہیں یعنی ہر شعر کا مضمون جدا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا جاتا ہے اس لئے غزل کو قطعہ بند ہونا چاہئے جسمیں اول سے آخر تک مسلسل طور پر اسی کیفیت یا جذبہ کا اظہار کیا جا سکے، قایم نے اس مطالبہ کو بھی بہت کچھ پورا کیا ہے، چنانچہ قایم کے قطعات و رباعیات کی تمام تذکرہ نویسوں نے داد دی ہے

شیفتہ تحریر فرماتے ہیں۔

"لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

قایم کے عاشقانہ قطعات ملاحظہ ہوں،

کان تک یار کے قایم مرے اس عالم سو　　رفتہ رفتہ جو گزر جانے کا مذکور گیا
سن کے اتنا تو کہا حیف کہ اس دنیا سے　　ناز برداریٔ معشوق کا دستور گیا

یار کیوں بکتے ہو بیفائدہ مجھسے جاؤ　　اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہ تجھے غم ہو کسی عاشق کا　　یا کوئی جیو نصیبوں ستی یا مر جاؤ

میں کہاں خلق تمہاری جو کمر کہتے ہیں　　تم بھی کچھ اس کا کہیں ذکر و بیاں سنتی ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یہ بات　　ہو دیگی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سنتی ہو

خوب نکلے ہم اس کے کوچہ سے　　ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل　　دل گرا شاید اضطراب میں رات

رباعی کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

دیکھ حال مرا اٹھا کے سو سو چھلے ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم سو اُسکے بھی ہو چلے ہیں ٹانکے ڈھیلے

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہل نعیم بیقدر کریں ہم کو جو دیکر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

کسی متمدن قوم اور متمدن زبان کا دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کے اثر سے محفوظ رہنا اصول تمدن کے خلاف ہے، اسلئے یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ اردو شاعری نے ایک طرف فارسی زبان کے سرمایہ سے مدد لی ہے تو دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی بھی خوشہ چینی کی ہے اور ملکی خصوصیات اور ملکی رسم و رواج نے بھی اپنا اثر ڈالا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ملکی اور مذہبی خصوصیات کا اثر ہر دور کے شعرا کے کلام میں نظر آتا ہے، چنانچہ قایم بھی اس سے متاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے،

دل میرا تم کو تو لنکا ہے دسہرہ کی تہاں فتح ہے سال بھر اُسکی جو اُسے لوٹے گا

بھری آتی ہیں قایم پے بہ پے آنسو سے کہے تو چشم کو میری کہیں یہ رہٹ کی گھڑیاں

یہ امر مسلم ہے کہ علم و ادب کو ہمیشہ شاہانہ سرپرستی و مربی گری کی ضرورت رہی، علوم و فنون نے اسیوقت ترقی کی جب کہ علم دوست سلاطین نے اپنی علم دوستی کا ثبوت کا مادی صورت میں دیا یعنی علما و فضلا کو کسب معاش و فکر روزگار سے نجات دلائی جب تک کہ "بقاے حیات" کی جد و جہد سے ان کو اطمینان و یکسوئی حاصل نہ ہوئی وہ اپنی پوری توجہ علم و فن کی طرف مبذول نہ کر سکے، خلفاے عباسیہ کے عہد میں فنون نے جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں، مغلیہ شاہنشاہوں کے سایۂ عاطفت میں جیسے باکمال اہل علم کا مجمع رہا تاریخ انکا ثبوت دیتی ہے، دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ نے اپنی علم دوستی کے اظہار میں جامی و حافظ کو ایران سے مدعو کیا تھا، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی علمی فیاضیاں زبان زد عام ہیں، مختصر یہ کہ اہل علم اپنے کمالات کا اظہار بخوبی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کو اطمینان قلب حاصل نہ ہوا، جب تک دہلی کی دولت و ثروت، علما کے اخراجات کی متحمل ہو سکی علما و فضلا و ادبا مثل پروانہ جمع رہے اور جب تباہی آئی تو ایک ایک کرکے دہلی سے رخصت ہوئے اور تلاش روزگار میں سفر اختیار کیا، کوئی کسی نواب کے دربار تک پہونچا اور کوئی کسی امیر کے محل تک، کسی کو وزیر اودھ کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی، الغرض تمام شعرا اور اہل کمال نبات النعش کی طرح منتشر ہو گئے، چنانچہ قایم بھی دلی سے رخصت ہو کر وطن آئے اور کچھ دنوں یہیں رہے،

اردو شاعری کی ترقی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ دکن کی اسلامی سلطنتیں کمال عروج کو پہونچ چکی تھیں، چنانچہ اردو شاعری نے انھیں سلطنتوں کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما حاصل کیا، سلطان ابراہیم عادل شاہ، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور قطب شاہ و محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ و ابوالحسن تاناشاہ کی سرپرستی و ادب نوازی نے شعر کو کسب معاش سے بے نیاز

کردیا، اسی باعث ان کی دماغی قوتوں نے میدان تغزل کو رنگا رنگ کی چمن آرائی سے باغ و بہار بنا دیا اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں اُس کی سرپرستی کی گئی اور یہ سلسلہ بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا، دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعرا نے لکھنو کا رُخ کیا، خان آرزو حملہ نادری کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنو چلے آئے، اسیطرح دیگر شعرا بھی وارد لکھنو ہوتے گئے اور لکھنو کو شاعرانہ حیثیت سے ایک قسم کی مرکزیت حاصل ہوگئی، اس لٹے ہوئے قافلہ کی سرپرستی کا آغاز اگرچہ شجاع الدولہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا لیکن شعرا کی قدر دانی کا اصلی زمانہ آصف الدولہ کے عہد وزارت سے شروع ہوا اور غازی الدین حیدر کے زمانہ تک قایم رہا، فذراے اودھ کے ساتھ لکھنو اور لکھنو کے علاوہ دوسرے مقامات میں امرا و رؤسا کے درباروں میں شعرا کی قدردانی ہوتی تھی، ان میں مرزا سلیمان شکوہ نواب محبت خاں، نواب مہربان خاں رند اور نواب محمد یار خان کے درباروں سے اس دور کے اکثر اساتذہ کا تعلق تھا مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جراءت پہلے نواب محبت خان کے دربار میں تھے لیکن بعد کو وہ بھی مرزا سلیمان شکوہ کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگئے، مرزا رفیع سودا اور میر سوز نواب مہربان خاں سے تعلق رکھتے تھے، نواب محمد یار خاں امیر، نواب محمد خان مورث نوابان رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، آنولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے وہاں کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا اول اول جب سخن گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو اپنی استادی کے لئے میرزا رفیع سودا اور میر سوز کو بلایا، ان دونوں بزرگوں سے نواب مہربان خاں رند کے ہاں ملازم ہونے سے معذوری ظاہر کی تو بالآخر قرعۂ فال قایم چاندپوری کے نام پڑا، اور ان کو بلاکر سو روپیہ ماہانہ کردئے، اور ان سے مشق سخن کی، جس سے قایم کو استادی کا شرف حاصل ہوا، چنانچہ وہ خود اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

جو قایم خوبی کونین ہے قصد تو خدمت کر محمد یار خاں کی

قایم کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا مثلاً ندوی لاہوری، میر محمد نعیم، میاں عشرت، حکیم اکبر علی سنبھلی اور پروانہ علی شاہ مرادآبادی اور مصحفی وغیرہ بھی مقربین بارگاہ تھے رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور نواب صاحب موصوف جو غزل طرح کہتے تھے ذی قدر اس کو سرانجام دیتے تھے، چنانچہ قایم نے ایک شعر میں اس اجتماع کا ذکر کیا ہے ؎

تجھ کو قایم رکھے اللہ بہت سا اے امیر مجتمع سایہ میں ہیں جسکے سخنداں ایسے

نواب صاحب موصوف کے حکم سے اس زمانہ کے مشہور مصور عاقل خاں نے ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نواب اور ان کے حاشیہ نشیں شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں جو اگر اس زمانہ میں موجود ہوتا تو ایک یادگار چیز خیال کیا جاتا، (شعرالہند و تذکرہ گل رعنا) مرہٹہ گردی میں تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہوگئے اور نواب کو فیض اللہ خاں آکر رامپور لیگئے اور پچاس ہزار روپے سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کردیا، ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی، دلی کی تباہی کے بعد کچھ دن وطن میں پریشان حال رہنے کے بعد قایم کو یہاں اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن جب یہاں بھی بخت سیاہ نے چین لینے نہ دیا تو فلک کجرفتار کو شکوہ کرتے ہوئے یہ بھی رامپور چلے گئے۔ احمد یار خان پسر نواب فیض اللہ خان نے ان کی تنخواہ مقرر کردی، کچھ دنوں اسپر قناعت کی لیکن جب

تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹیک رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام کے گئے، یو ہیے اور ملکیتین جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے، وفات تک وہیں مقیم رہے،
(تذکرۂ گل رعنا و شعر الہند جلد اول)

غرض اس دور میں شاعری ایک لازمۂ امارت بنگئی تھی اور تقریباً ہر ایک امیر کے دربار میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہو گیا تھا، جو شعرا کی معاش اور قدردانی کا اصلی ذریعہ تھا یہ قدردانی ایک حد تک شعرا کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اس لئے کہ اُن کو کسب معاش کے افکار سے نجات ملی، لیکن ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شعرا کے کلام کی تمامتر کامیابی امراو سلاطین کی پسندیدگی پر موقوف رہگئی چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

مانوں گا، شاعری کو میں قایم تبھی تیری ۔۔۔ سرسبز یہ غزل ہو جو نواب کے حضور

قایم سمجھ کے بولیو نواب کے حضور ۔۔۔ پیارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ

باقی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ باقی

سعیدی، بی اے (علیگ) ایم آر اے ایس (لندن)

اَب بھی وقت ہے

کہ آپ "ظریف شاعروں کا تذکرہ" نصف قیمت پر حاصل کر سکیں یہ تذکرہ تقریباً ۔۔۔ صفحات پر شائع ہو گا اس کی قیمت (للعہ) سے کم نہ ہو گی۔ آپ نے اشاعت سے قبل دو روپیہ ذریعہ منی آرڈر بھیجدئے تو آپ اتنی ہی رقم میں اس کے پانے کے مستحق ہو جائینگے یہ تذکرہ اس قدر مکمل ہے۔ اور نئی چیز ہے کہ زبان اردو میں اس موضوع پر اس سے قبل کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔

سیکڑوں ظریف شاعروں کے حالات ان کے لطائف و ظرائف اور ان کا ظریفانہ کلام جو ہزاروں روپیہ صرف کرکے کے بعد بھی آپ کو نہیں نظر آسکتا۔ برسوں کی محنت و کاوش کے بعد ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے اور آپ اشاعت سے قبل اُسے صرف دو روپے میں حاصل کر سکتے ہیں۔ اشاعت کے بعد پھر کوئی رعایت نہ ہو گی یہ کتاب سوائے ہمارے اور کہیں نہیں مل سکتی۔ تھوک فروش ایجنٹ اور کتب فروش بھی اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ورنہ اشاعت کے ان کو زیادہ سے زیادہ (۲۰) فیصدی کمیشن ملیگا بغیر روپیہ وصول ہوئے کوئی آرڈر درج رجسٹر نہیں کیا جائے گا۔

مینجر "نگار" نظیر آباد لکھنؤ

شاہان بہمنیہ

محمد بن قاسم کا حملہ مسلمانوں کے پہلے حملے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر دکن میں سنہ ۹۰ھ ہی میں مسلمان آ گئے اور یہی ان کی آمد کہی جا سکتی ہے، عبد الملک بن مروان کے سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مظالم سے کون واقف نہیں وہ عبد الملک کی طرف سے عرب اور عجم کا صوبہ دار تھا، اس کے مظالم، بے باکیاں، سفاکیاں، خونریزیاں، نچلے طبقے تک ہی محدود نہ تہیں بلکہ اُسنے شرفاء عرب اور سادات بنی ہاشم کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا، سادات کو خانماں برباد اور شرفاء کو تباہ و تاراج کرنا، اس کا نصب العین تھا اور اسکی ظلم و زیادتیاں عالمگیر تھیں، آل مصطفوی کو اس کے ہاتھوں ایسی تکالیف پہونچیں کہ یزید ہی کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا،

سادات و شرفاء عرب نے مجبوراً ہجرت کرنی شروع کی اور چند قبائل عرب نے بنا در دکن کا رخ کیا، باد مخالف کے جھونکوں نے کئی دن تک ان خانماں بربادوں کو پریشاں و سرگرداں پھرا کر ان کے ٹوٹے پھوٹے جہاز بندر مالا بار مچھلی بندر بھڑوچ، کھنبایٹ، چیول، دابول کے کنارے لگا دیئے۔

دکن کے ہندوؤں کے نزدیک یہ قوم ملیچھ اور نئی تھی، پہلے تو ان کو جہازوں سے اترتے ہی نہیں دیا گیا مگر جب ان لوگوں نے خوشامد درآمد شروع کی تو ایک اقرارنامہ لیکر ٹھہرنے کی اجازت دی، اقرار نامہ کا مضمون یہ تھا کہ :- "مسلمان ہنود کے مراسم اختیار کریں اور انہیں کا لباس استعمال کریں - ارکان اسلام علی الاعلان ادا نہ کریں" غریب مسلمانوں کو سر چھپانا منظور تھا سنگ آمد و سخت آمد کہکر یہ شرطیں منظور کرلیں اور ہنود میں مل جل کر گزر بسر شروع کی، شعائر اسلامی بہت احتیاط سے ادا کئے جاتے تھے اذان و قرأت گھر کی چار دیواری کے باہر سنائی نہ دیتی تھی، عورت اور مرد ہنود کا لباس استعمال کرتے تھے اور شادی و غمی میں ہنود ہی کے رسوم ادا کئے جاتے تھے رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں نے اہل ہنود کے پورے طریقے اختیار کر لئے البتہ اس قدر لحاظ ضرور رکھا کہ نہ تو اپنی لڑکیاں ہندوں کو دیں اور نہ ان کی لڑکیاں اپنے خانداں میں لیں،

سنہ ۳ھ سے دکن میں بزرگان دین کی آمد شروع ہوئی جو ایک طرح سے مبلغین کہلا سکتے تھے ان میں بعض تاجر تھے بعض درویش اور بعض سپاہ مگر سب کا نصب العین ایک ہی تھا اور مختلف طریقوں سے تبلیغ کیا کرتے تھے، ان لوگوں کے حسن و اخلاق کا اثر ہنود پر بہت گہرا پڑا اور منافرت جو پہلے مسلمانوں سے تھی اب نہ رہی اور بہ خندہ پیشانی مسلمانوں سے پیش آنے لگے ان بزرگوں کی کرامات اور خرق عادات سے ہنود نے انہیں اوتار مان لیا اور حالت رنج و غم، مصیبت و پریشانی میں طالب دوا و دعا ہونے لگے، صرف عام ہنود ہی مسلمان مبلغین کے معتقد نہ تھے۔ بلکہ راجگان دکن کو بھی ارادت تھی، جب لوگوں نے حکومت کا میلان بھی اسلام کی طرف دیکھا تو ایک ایک کرکے مسلمان ہونے لگے، یہ صرف مسلمانوں کی تعلیمات

اور اخلاق تھے ورنہ ہنود اپنی حکومت میں کیوں اسلام کو جاری ہونے دیتے۔

راجگان دکن کی یہ بے تعصبی بہی لائق تحسین و تشکر ہے کہ انھوں نے جب ہندؤں کا رجحان مذہب اسلام کی طرف دیکھا تو نہ تو ہندؤں کو مسلمان ہونے سے روکا اور نہ مبلغین اسلام سے باز پرس ہی کی۔

ادہر دکن میں اس طرح چپکے چپکے اسلام کی اشاعت ہو رہی تہی اور ادہر سلطان محمود غزنوی کی تیغ براں اپنے جوہر دکھا رہی تھی بہرحال چوتھی صدی کے آخر تک دکن میں شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں آفتاب اسلام کی شعاعیں اپنی نورانی کرنوں سے روشنی نہ بیدا کر چکی ہوں، اس وقت دکن میں حسب ذیل چار سلطنتیں قایم تھیں،

(۱) راجہ رام چندر نے دیوگیری میں یادہری حکومت قایم کی تہی جو ۱۲۷۱ء سے ۱۳۱۰ء تک رہی،

(۲) رانی رودرا مہانے ورنگل میں کاکتیا حکومت قایم کی جو ۱۲۹۱ء سے ۱۳۲۸ء تک رہی

(۳) ہتنار اور نیلور کی ہائیسالہ حکومت،

(۴) پانڈیہ جو جنوبی حصہ پر قابض تھے،

جب غزنوی اور غوری خاندان کے بعد خاندان غلامان نے حکومت قایم کی اور پھر خلجی خاندان کو عروج ہوا تو علاء الدین خلجی نے جو جلال الدین خلجی کا بھتیجہ تھا، تسخیر دکن کا ارادہ کیا اس سے پہلے کسی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا، یہ حملہ ۱۲۹۴ء میں اتفاقاً ہوا اور قسمت نے اس کو دکن کا پہلا فاتح بنا دیا، اس حملہ کی وجہ یہ تہی کہ علاء الدین گورنر کڑہ جب بھیلسان میں مقیم تھا تو اُس کو اطلاع ملی کہ دکن کے راجہ رام دیو کے پاس موروثی خزانہ محفوظ ہے اور وہ ایسا گرانمایہ خزانہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ کو میسر نہیں ہوا، یہ سنتے ہی وہ کڑہ پہونچا اور بقول ضیا برنی آٹھ ہزار سوار ہمراہ لیکر دیوگیری کی طرف کوچ کیا اور دکن میں پہونچکر لاجور گھٹی میں ڈیرے ڈالدئے۔

اس علاقہ کے دہشت زدہ کسانوں نے یہ خبر راجہ رام دیو کو پہونچائی اور وہ نہایت ہی عجلت سے ایک غیر منتظم کثیر لشکر مقابلہ کے لئے فراہم کیا۔ مگر علاء الدین کے جوش و خروش کے آگے اس لشکر کے قدم نہ جمے اور علاء الدین دیوگیری پہونچ گیا، علاء الدین کے متواتر جانبازانہ حملوں نے راجہ کو اس قدر سراسیمہ کر دیا کہ اس نے فوراً صلح کی کوشش شروع کی اور چھ سو من طلا، سات من مروارید، دو من جواہر (لعل یاقوت وغیرہ) دیکر اور سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

جب علاء الدین تخت نشین ہوا اور اندرونی الجھنوں سے نجات ملی تو ۱۳۰۶ء میں دیوگیری کو صوبہ بنانے کے خیال سے رام دیو کی سرکشی کا بہانہ کر کے ملک کافور ہزار دیناری کو ایک لاکھ سوار سائیاں و سرا پردۂ شاہی کے ساتھ روانہ کیا، ملک نائب نے نہایت ہی سہولت سے دیوگیری پر قبضہ کر لیا اور رام دیو اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر کے خزانہ شاہی کے ساتھ علاء الدین کے سامنے پیش کر دیا، علاء الدین نے نہایت دوراندیشی سے کام لیکر رام دیو کو "راے رایاں" کے خطاب سے سرفراز کیا اور چتر سفید دیکر دوبارہ دیوگیری کی حکومت عطا کی،

۱۳۰۹ء میں ملک کافور نے ورنگل پر حملہ کیا اور راجۂ ورنگل نے بہ وعدۂ خراج صلح کر لی،

۱۳۱۲ء میں علاء الدین نے دکن پر آخری حملہ کیا اور راجۂ دیوگیری کی بغاوت کی وجہ سے ملک کافور کو روانہ کرکے دیوگیری کو تباہ و تاراج کرنے کے علاوہ راجہ (شنکر) کو بھی قتل کرا دیا۔

۱۳۱۵ء میں علاء الدین نے انتقال کیا اور راجگان دکن نے سرکشی کی۔ مگر ۱۳۲۳ء میں محمد تغلق نے پھر دکن کے علاقۂ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۳۴۴ء میں دکن کے راجاؤں نے پھر سرکشی کی اور بغاوت کرکے شہر دیجانگر آباد کیا، دکن کے ممالک مفتوحہ تقریباً سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ البتہ صرف دیوگیری پر سلطان محمدؒ کا قبضہ رہا۔

ملکِ دکن کو کھو کر سلطان دوآبہ کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بیدر میں نصرت خان اور گلبرگہ میں علی شاہ نے بغاوت کی جسکو فرو کرنے کے لئے قتلغ خاں حاکم دیوگیری روانہ کیا گیا، جس نے نصرت خاں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور علی شاہ کو گرفتار کرکے سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ غلطی بھی کی کہ قتلغ خان کو دکن سے طلب کرکے نظام الدین عالم الملک کو دکن روانہ کیا سلطان محمد نے امیرانِ صدہ کی بغاوتوں سے تنگ ہو کر ان کے قتل کا ارادہ کر لیا اور سپہ سالار دکن کے نام فرمان بھیجا کہ ایک ہزار پانسو سواروں اور امیراں صدہ کو بھروچ روانہ کر دے۔ عالم الملک نے نہایت ہی وقت سے امیراں صدہ کو دولت آباد (دیوگیری) بلوایا اور سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، مگر جب یہ لوگ مانک دون پہونچے تو سلطان کی متلون مزاجی اور خونین طبیعت سے خائف ہو کر آپس میں مشورے کرنے لگے اور واپسی کا ارادہ کر لیا، ملکِ لاچین کی شامت جو آئی تو اس نے روکنا چاہا مگر یہ کب ماننے والے تھے اس کو قتل کر دیا اور مال و اسباب لوٹ کر دولت آباد کی طرف چلے، دولت آباد پہونچ کر قلعہ کا سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا اور چند ہی روز میں فتح کرکے خزانہ بانٹ لیا۔ اور اسمٰعیل مغ کو بادشاہ تسلیم کرکے ناصر الدین کا خطاب دیا۔ چیتر شاہی سے عزت افزائی کی، حسن خان کو ظفر خان خطاب دیا اور ہر ایک اپنی اپنی جاگیر میں جا کر باغی ہو گیا۔

حسن خان نے رائے بھیرنِ حاکم گلبرگہ کو قتل کرکے تسلط کیا اور اطراف کے امیرانِ صدہ کو بلا کر حکومت مستحکم کی، چند ہی مہینوں میں سارا دکن سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان پریشان ہو کر دولت آباد پہونچا، اسمٰعیل مغ نے مقابلہ کیا مگر شکست نصیب ہوئی اور وہ دہارگیر میں جا کر قلعہ بند ہو گیا دوسرے امرا بھی اپنی اپنی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے دہارگیر کا رخ کیا ہی تھا کہ حاکم گجرات کے بغاوت کی خبر ملی اور وہ قوام الدین خداوند زادہ اور دیگر امراء کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود گجرات روانہ ہو گیا۔

ادھر حسن خان نے بیدر پر حملہ کر دیا اور تلنگانہ کے راجہ کی مدد سے عماد الملک کے لشکر کو تہس نہس کرکے اور اس کو قتل کرکے اسمٰعیل مغ کی مدد کے لئے روانہ ہوا، حسن کا نام سنکر محاصرہ کنندہ امرا نے فرار پر فرار کیا اور حسن نے اطمینان سے دولت آباد پر قبضہ کر لیا، اسمٰعیل مغ نے حسن کی ہر دلعزیزی اور شجاعت دیکھکر یہی مناسب خیال کیا کہ اسی کو بادشاہ بنا دے چنانچہ وہ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور حسن گانگو کو بادشاہ بنا دیا۔ ۷۴۸ھ میں سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو مدت اللہ

کی مسجد میں سب نے بادشاہ تسلیم کر لیا اور سر پر تاج سلطانی اور چتر سیاہ قایم کیا گیا، اور ممالک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا
حسن نے گلبرگہ کو پسند کر کے دار السلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

یہ تھی ابتدا سلطنت بہمنیہ کی، مگر علاء الدین حسن بہمنی کے ابتدائی حالات نہایت ہی تاریکی میں ہیں، مورخین نے سخت اختلاف کیا ہے۔ طاہری نے مجہول النسب لکھا ہے، زبدۃ التواریخ میں مفلوک الحال ترکی الاصل بتایا ہے فرشتہ نے گانگو پنڈت منجم کا ملازم ٹھیرایا ہے، تحفتہ الملوک میں شریف زادہ اور محمود شاہی افاغنہ سے لکھا ہے صوفی ملکاپوری نے مدت کی تلاش و جستجو کے بعد حسن کا امیر زادہ اور ملوک غوریہ سے ہونا ثابت کیا ہے، "مرات الصفا" نے تو بہمن و شاہ عجم) کے خاندان سے ملا دیا ہے۔

ہمارے مورخین کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بادشاہ سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو اس کو خواہ مخواہ بڑا بنانے کی فکر کرتے ہیں یا تو اسکا شجرہ نسب ائمہ مطہرین یا سادات بنی ہاشم سے ملا دیتے ہیں یا تو شیروان و افراسیاب سے ورنہ کسی مشہور صاحب دل بزرگ، یا بادشاہ سے شجرہ ملا دینا معمولی بات ہے اسی طرح حسن بہمنی پر بھی مہربانی کی ہے۔

ظفر خاں علائی کے قتل کے بعد اسکا خاندان پریشان ہو گیا۔ حسن شاہ اور علی شاہ اس کے دو بھانجے بھی انہیں پریشان حال لوگوں میں تھے، فاقہ کشی سے تنگ آکر حسن نے دہلی کا رخ کیا اور کئی روز کی مسافت طے کر کے صبح صبح دہلی پہونچے، دریائے جمنا کا پانی اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ حسن نے وضو کیا اور فریضۂ فجر کی نیت کی۔ فاقہ کشی اور مصائب سفر نے اس قدر پست کر دیا تھا کہ قدم قدم پر چکر آ رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے جمنا کی سرد ریت پر سربسجود ہوا ہی تھا کہ نیند یا غشی نے غلبہ کیا اور وہ حالت سجدہ ہی میں بیہوش ہو گیا، منجم شاہی گانگو پنڈت حسب عادت غسل کے لئے آیا تو دیکھا کہ ایک جوان رعنا سجدہ میں پڑا ہوا ہے، چہرے سے آثار شرافت و شجاعت نمایاں ہیں، گو خستگی سفر نے رنگت سیاہ کر دی ہو مگر آفتاب کی بھیگی بھیگی کرنیں زرد رخساروں کو چمکا رہی ہیں، برہمن نے حسن کو جگا کر حال دریافت کیا اور اشنان کے بعد اسکو اپنے گھر لے آیا، کئی دن تک حسن، برہمن کا مہمان رہا مگر اس کی غیور طبیعت نے پڑے پڑے روٹیاں کھانا گوارا نہیں کیا اور اس نے برہمن سے کہا کہ یا آپ مجھ سے کچھ کام لیا کیجئے یا کوئی کام دلوا دیجئے۔ برہمن نے دو بیل اور دو مزدور اور تھوڑی سی زمین اس کو دی اور حسن نے کھیتی باڑی شروع کی، ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ یکایک ہل کا سرا زمین میں پھنس گیا اور باوجود کوشش کے نہ نکلا مزدوروں نے حسن کو اطلاع کی اور حسن نے زمین کھدوا کر دیکھا تو ہل کو ایک زنجیر میں اٹکا ہوا پایا زنجیر نکالنےکی کوشش کی تو اس کے ساتھ ایک دیگ برآمد ہوئی جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں حسن نے اس دیگ کو بہ حفاظت برہمن کے حوالہ کر دیا برہمن کو حسن کی دیانت و راست بازی پر تعجب ہوا کہ باوجود فاقہ کشی اس میں اس قدر امانت و دیانت ہے۔ اس نے یہ خبر شاہزادے کو دی اور شاہزادے نے ایک دفعہ غیاث الدین سے حسن کا تذکرہ کیا، غیاث الدین نے حسن کو بلا کر اس کا حال پوچھا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ ظفر خاں علائی کا ہمشیرزادہ ہے امیران صدہ میں داخل کر لیا، چونکہ غیاث الدین ظفر خاں کا دوست رہ چکا تھا

اس لئے حسن پر بہت مہربان رہنے لگا۔

غریب اور مفلوک الحال حسن کو امیرِ صدہ ہوتے دیکھ کر گانگو منجم نے زائچہ بنایا تو دیکھا کہ حسن کے ستارے بادشاہت میں ہیں، اس نے حسن سے کہا کہ تم دکن کے بادشاہ ہو جاؤگے اور یقین ہے کہ اس وقت مجھے یاد بھی نہ کروگے کہ کسی برہمن نے میری مدد کی تھی حسن نے کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اگر میں بادشاہ ہوگیا تو آپ کو وزیر بناؤنگا اور آپ کے نام کو اپنے جزوِ نام کر لونگا۔

یہ روایت کسی قدر قریب قیاس ہے اس کا امکان ہے کہ حسن ظفر خان علائی کے خاندان سے ہو اور فاقہ کشی کرتا ہوا دہلی پہونچا ہو، اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا وقت تھا برہمن نے ممکن ہے کہ اس کی مدد کی ہو اور تھوڑی سی زمین کاشت کرنے کے لئے دی ہو، پہلے تو ہندو مسلمانوں سے اس قدر متنفر نہ تھے جتنے کہ اب ہیں اور نہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر معتبر اور خوفناک بنا لیا تھا جیسی حالت کہ اب ہے، دلی ہزاروں دفعہ اجڑی اور آباد ہوئی اب بھی کروڑوں خزانے سیکڑوں دفینے ہوں گے۔ کیا عجب ہے کہ حسن کو بھی کوئی ایسا دفینہ ملا ہو اور اس نے برہمن کے حوالہ کر دیا ہو جس کی شہرت غیاث الدین تک پہونچی ہو، ماہران نجوم جانتے ہیں کہ امارت و بادشاہت کی پیشین گوئی اجرام فلکی کی رفتار دیکھ کر بہ آسانی کی جاسکتی ہے اسیطرح یہ ناممکن نہیں کہ برہمن حسن کی بادشاہت کی پیشین گوئی کر سکے۔ اور برہمن سے اس کے نام کو جزوِ نام کرنے کا وعدہ کرے علاوہ ازیں آج تک نہ کوئی گانگوی خاندان تھا اور نہ بہمن شاہ عجم کے خاندان کے کسی فرد نے اپنے آپ کو بہمنی کہا ایسی حالت میں سوائے اس کے کہ ہم اس روایت کو قرینِ قیاس تصور کریں کوئی چارہ نہیں۔

حسن کو دکن پہونچنے کی بہت جلدی تھی جب بادشاہ نے قتلغ خان کو دولت آباد (دیوگیری) کا صوبہ دار مقرر کیا اور امیران صدہ سے دکن جانے کے متعلق دریافت کیا تو سب سے پہلے حسن نے آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ نے ہگڑی، رائے باغ وغیرہ جاگیر دے کر حسن کو دکن روانہ کر دیا اس نے اپنے ہمراہ اسمٰعیل مغ اور ملک سیف الدین غوری کو بھی لے لیا اور دولت آباد کا رخ کیا، یہاں پہونچکر حسن نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر لکھی جاچکی ہے۔

۲۴ ربیع الاول ۷۴۸ھ کو دولت آباد کی قطب الدین خلجی کی مسجد میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی رحنے حسن کو تخت نشین فرمایا اپنے دستِ مبارک سے تلوار باندھی اور تاج زرین پہنا کر چترِ سیاہ تبرکاً لوازمۂ شاہی مقرر کیا، اس چتر کی وجہ سے لوگوں سے حسن کو شیعی خیال کر لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے حضرت شیخ جنیدی نے سیاہ چتر کو خلفائے عباسیہ کا نشان سمجھ کر پسند فرمایا تھا۔

حسن نے گلبرگہ کو دار السلطنت قرار دیا اور دفترِ حساب گانگو پنڈت کے سپرد کیا یہ طریقہ ۱۰۱۶ھ تک جاری رہا کہ شاہان دکن کی دفترداری اور محرری برہمنوں ہی کو ملتی رہی۔

حسن نے اپنی شمشیر اور تدبیر کے زور سے دکن کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ایک مہم کرناٹک کی طرف بھیج کر اسے بھی

کامیابی حاصل کی۔ اہل گجرات تغلق کے ہاتوں سے تنگ تھے انھوں نے حسن کو بلوایا مگر وہ خود نہ جاسکا اس لئے اپنے بیٹے محمد کو روانہ کردیا شہزادۂ محمد گلبرگہ سے نکل کر نوساری پہونچا اور وہاں شکار کی کثرت دیکھ کر بے چین ہوگیا خود ہی وہیں ٹھہر گیا اور حسن کو بھی بلوایا۔ مگر حسن نوساری پہونچتے ہی ہیضہ کرگیا اور اس سے صحت پاکر اور امراض میں مبتلا ہوگیا جن کا سلسلہ چھ چھینے تک رہا اور ۵ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں (۶۷) سال کی عمر پاکر گیارہ سال دو ماہ سات روز سلطنت کرنیکے بعد انتقال کیا

چون حسن رحلت ازین عالم نمود　　　　وصل شد باحق بفضل ذوالمنن

شاہ جنت سال ترحیلش بگو　　　　ہم مقرب محسن عالم حسن

۷۵۹ھ　　　　۷۵۹ھ

حسن کے انتقال کے وقت مرا ہٹواڑی، تلنگانہ، کرناٹک کے مختلف حصے سلطنت بہمنیہ میں شامل تھے، جن پر ہندو راجاؤں کا تسلط تھا، مشرق میں راجۂ تلنگانہ، جنوب میں راجۂ بیجانگر، کرناٹک پر قابض تھے اور یہ ایسے بڑے دھرے تھے کہ حسن کو ہمیشہ ان سے خدشہ لگا ہوا تھا، جس نے سلطنت کو بہت وسعت دی اور نہایت ہی بیدار مغزی کے ساتھ سلطنت کی دریائے پونا سے قلعۂ ادھونی تک اور چیبول، دابل سے بیدر تک اسکا قبضہ تھا۔ اس نے نئی نئی اصلاحیں کیں اور سلطنت بہمنیہ کی جڑیں اس قدر مضبوط کردیں کہ وہ دیر تک حوادثات زمانہ کا مقابلہ کرتی رہی۔ انتظام مملکت، عدالت، سیاست وغیرہ سے اُسے خاصی دلچسپی تی اور وہ ہر کام نہایت ہی تجربہ کاری اور وسیع النظری سے کیا کرتا تھا، ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ اس نے کیسے عہدے قائم کئے تھے اور ان عہدوں پر کس قدر تجربہ کار۔ اور موزون اشخاص کا تقرر ہوا تھا

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید صدر الشریف سمرقندی	صدر عدالت	صفدر خاں سیستانی	شقدار صوبۂ برار
سید محمد بدخشی	قاضی عسکر	اعظم ہمایوں	" " ورنگل
ملک سمٰعیل منح	امیر الامراء	خان محمد بن علی شاہ	نائب صوبۂ دولت آباد
سید رضی الدین جگا جوت	معتمد و وکیل السلطنت	محمد اسحٰق سرہندی	صدر وقائع نگاراں
ملک سیف الدین غوری	وکیل السلطنت	بہادر خاں بن اسمٰعیل منح	سپہ سالار
گانگو پنڈت	صدر محاسب	کلیم اللہ ماژندرانی	سرخیل
سکندر خاں	بارک	بایزید خاں	میر بحری
قیر خاں	کوتوال شہر	ملک جہجو	شحنہ فیل
بہرام خاں ماژندرانی	شقدار صوبۂ دولت آباد	ملک رشدو	جامدار

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید جمال الدین	خزانہ دار	سید نور الدین	محتسب (نرخی)
فولاد خاں	قوربیگی	سید نقی اصفہانی	صدر محفلیں
سید احمد ہروی	مفتی	میرزین العابدین	تمغاچی کروڑ (کسٹم کمشنر)

اس کے علاوہ ملک ستم، پردہ دار، ملک قوام الدین غوری، افسر خاصہ خیل، شیخ منہاج الدین جنیدی قاضی گلبرگہ ملک التنہ، شحنۂ بارگاہ اور آبدار خانہ، خدمت عرض لکر، ڈاک چوکی، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کے لئے جا بکاردیں نامزد کی گئی تھیں، ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کو صبح سے دوپہر تک "بارگاہ کل" (دربارعام) ہوا کرتا تھا، انتظام عدالت بالکل شرعی تھا، ایک صدر عدالت اور اس کی ماتحتی میں کئی مفتی، محتسب، قاضی، فوجدار، داروغہ، وغیرہ تھے، سلطنت چار صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر صوبہ کے متقرپر دس ہزار اور پیادہ فوج رہتی تھی اور پایہ تخت میں ایک لاکھ جمعیت، فوج کے لئے خاص وردی مقرر کی گئی تھی، -

(۱) سواروں کی وردی - قبا، خود، شمشیر، نیزہ، دستار سُرخ،

(۲) پیادوں کی وردی - پاجامہ (برچیز نما) الخالق بطور کپچہ کلاہ مدور سیاہ،

(۳) کرناٹکی سواروں کی وردی - پاجامہ زانوتک کپچہ سیاہ پگڑی سرخ بلدار

(۴) نایک واڑی پیادوں کی وردی - سواروں کی وردی کی مگر قیمتی اور خوشنما،

(۵) امراء و وزراء کا لباس - قبا، دستار، منصب داری، بگلوس

(۶) مشائخ و علماء کا لباس - جبہ، کرتا، صدری، عمامہ،

اس کے علاوہ خدام و شاگرد پیشہ لوگوں کو قبا، کلاہ، بگلوس، اور نقیبار و چوبداروں کو قبا، کلاہ عصا، بگلوس وغیرہ، ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں مساجد بنائے گئے تھے اور ہر ایک مسجد کے لئے امام موذن، مدرس، مقرر تھے جو لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے - بڑی مساجد میں طلباء کے لحاظ سے مدرسین مقرر کئے جاتے تھے -

خود حسن کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی ہمیشہ علماء کی صحبت میں رہا کرتا تھا، مولانا لطف اللہ سبزواری، ملا معین ہروی مفتی احمد ہروی، ملا اسحٰق شیرازی، ملا فضل اللہ انجو، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی، ملک رکن الدین غوری ملک سیف الدین غوری، سید رضی الدین جگّا جوت وغیرہ جیسے علماء و حکماء بہمنیہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے -

شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص اساتذہ مقرر تھے محمد، محمود، اور داؤد، تینوں شہزادوں کی تعلیم مولانا

فضل اللہ انجو کے تفویض تھی اور مولانا کے زیر نگرانی اساتذہ آکر پڑھایا کرتے تھے۔

مدارس کا اعلیٰ انتظام تھا، ایلچ پور (برار) میں ایک دار العلوم کھولا گیا تھا جس کا ایک وسیع دار الاقامہ بھی تھا اس کے اخراجات کے لئے سالانہ تیس ہزار ہون آمدنی کی جاگیر وقف تھی (ہون مثادی ہے ½ ۳ روپیہ کلدار) اس کے علاوہ دولت آباد، گلبرگہ، وغیرہ میں بہت سے مدارس قائم تھے۔ طلبار کو وظائف نہیں دئے جاتے تھے بلکہ اُن کے خورد نوش کپڑے لتے کا ذمہ دار مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسین کی تنخواہیں معقول تھیں۔

حسن کو فنون سپہگری سے خاص شغف تھا اس نے ہر محلے میں ورزش خانے بنوا دئے تھے جہاں فنون سپہگری کی مشق کیجاتی اور تعلیم دیجاتی تھی، امراء کے لڑکوں کو تعلیم گاہوں میں جا کر کشتی، تلوار، بنوٹ وغیرہ سیکھنے کے لئے خاص تاکید تھی، شیر و شکار کا بھی بہت شوق تھا گلبرگہ کے اطراف صحرائے محصورہ اس کے شکار کے لئے مخصوص تھا، اکثر شکار کو جایا کرتا تھا آخر اسی شکار کا شکار ہوا اور ایسا شکار کرتے گیا کہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر واپس آیا۔

امراء دربار کو جاگیریں اور منصبین دے رکھی تھیں اور ہر طرح امراء کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔

پٹہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا، اور یہی انتظام اکبر کے زمانے میں بھی قایم رہا،

شرح مالگزاری نہایت ہی خفیف مقدار میں وصول کیجاتی تی، ٹیکس بہت کم تھے اور بہ مقدار قلیل وصول کئے جاتے تھے زراعت کی حالت اچھی تھی تجارت بھی اعلیٰ پیمانہ پر تی، صنعت و حرفت کو بہت عروج تھا، گلبرگہ میں پارچہ بانی کے کارخانے قایم تھے۔

سکہ۔ ہوں، تنگہ، وغیرہ کے نام سے متفرق سکے رائج تھے اس نے اپنے سکہ پر عبد معبود محمد محمود سلطان اعظم علاء الدین والدنیا "جانب راست، اور "المؤید بنصر اللہ ضرب فی حسن آباد" جانب چپ کندہ کرایا تھا، حسن، متوسط قامت، قوی ہیکل، سرخ رنگ، چالاک وجیہت، پر رعب، بہادر، خوش اخلاق ملنسار، ہمدرد، منکسر المزاج غریب الطبع، امانت دار مستقل مزاج تھا۔

بعض مورخین نے اس کی اولیات کی ایک طویل فہرست گنائی ہے جس میں سے چند یہ ہیں،

دکن میں سب سے پہلے اسلامی سلطنت قایم کی، ہندوستان اور دکن میں سب سے پہلے برہمن گانگو پنڈت کو ملازم رکھا سلاطین دکن میں صرف حسن ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس کی بیوی صرف ایک ہی تھی، اسی نے منصبداری دستار ایجاد کی، رسم ستی کو کم کر کے ا رسند کرنے کی کوشش کی مسلم اور غیر مسلم مردوں اور عورتوں کو آپس میں بیاہ دیا، دکن میں متعدد مناد ر بنائے اور ان کے اخراجات کے لئے جاگیرات وقف کیں، کرہمنوں پجاریوں، وغیرہ کے لئے معاش مقرر کی۔

حسن کا مزار گلبرگہ میں قلعہ کے پیچھے واقع ہے جس پر ایک خوبصورت مختصر گنبد بنا ہوا ہے جو نہایت ہی خستہ حالت میں ہے۔

سلطان محمد شاہ بہمنی

۲ ربیع الاول ۷۵۹ھ کو سلطان محمد شاہ بہمنی نے تخت سلطنت پر بڑی دھوم دھام سے جلوس کیا

حضرت شیخ سراج الدین جنیدی نے اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور امرا و وزرا نے نذریں دیں۔

محمد شاہ نے ممالک محروسہ بہمنیہ کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ (۱) گلبرگہ، (۲) دولت آباد، (۳) تلنگانہ، (۴) برار اسوقت تک دکن میں سکوں کا رواج نہ تھا مگر اُس نے طلائی سکے بنوائے جن کے ایک رُخ پر کلمہ طیبہ اور صحابۂ اربع کے اسمار گرامی اور دوسری طرف اپنا نام اور سنہ جلوس کندہ تھا۔

حسن نے جس نقری تخت پر جلوس کیا تھا اسی پر محمد شاہ نے بھی جلوس کیا، مگر ایک آبنوسی طلا کار تخت راے تلنگانہ نے شہنشاہِ دہلی کے لئے بنوایا تھا جو محمد شاہ کو تحفتہً دیدیا محمد شاہ نے اس کا نام "تخت فیروزہ" رکھکر اسی پر بیٹھنا شروع کیا اور یہ تخت سو برس تک خاندان بہمنیہ میں رہا، اور حسن کا بنوائی باہوائی نقرئی تخت فیروز شاہ کے عہد میں مدینۂ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد شاہ کی والدہ ملکۂ جہاں نے بیت اللہ کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے تمام خزانہ ساتھ کر دیا کہ سادات کو تقسیم کر دیا جائے امرا و وزرا نے بہت مخالفت کی کہ خزانہ میں کچھ تو رکھئے مگر محمد شاہ نے ایک نہ سنی اور خزانہ روانہ کر دیا ملکۂ جہاں نے حج سے فارغ ہو کر تمام خزانہ سادات کو بانٹ کر واپسی کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے بڑے کروفر سے استقبال کیا اور ایک بڑا بھاری جشن ترتیب دیا محمد شاہ نے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا اور اس کے چار حصے مقرر کر دئے (۱) سلحدار (۲) سرخیل (۳) جوانانِ یکہ (۴) باردار، روزانہ پچاس سوار دو ہزار خاصہ خیل، نوبت بہ نوبت حاضر در دولت رہا کرتے تھے، امرا و منصبداروں کے چوکی پہرے بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کرکے حسب ذیل خدمات قایم کی تھیں،

ملک سیف الدین غوری	وکیل سلطنت ملک نائب	بایزید خاں سسانی	افسر خاصہ خیل
بہادر خاں بن اسمٰعیل	امیر الامرا،	کلیم اللہ خاں مازندرانی	افسر جوانانِ یکہ
مقرب خاں بن صفدر خاں	میر آتش	سید شریف سمرقندی	صدر
موسیٰ خاں افغاں	افسر میمنہ	ملا محمد بن عین الدین	مفتی عسکر
عیسیٰ خاں	افسر میسرہ	محمود افغان	افسر سلحداراں
محمد اسمٰعیل ناعطہ	داروغۂ جواہر خانہ	سید جلال حمید	مصاحب
ملک محمود	خواں سالار	شاہ ملک غوری	مصاحب
ملا محمد مشہدی	میر ساماں	//	//

سب سے پہلے محمد شاہ نے در دولت پر نوبت مقرر کی اور پانچ وقت نوبت نوازی ہونے لگی جس کا رواج اب تک دکن میں ہے ہر جمعہ کو صبح سے دوپہر تک دربار عام کیا کرتا تھا، اور ہر ایک شخص کی شکایات سنتا تھا۔

تمام مشائخینِ دکن نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر شیخ زین الدین دولت آبادی نے صاف انکار کر دیا کہ "بادشاہ شراب خوار ہے اور دارالسلطنت میں شراب فروخت ہوتی ہے میں ایسے شخص کی بیعت نہ کرونگا" محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا اور اس نے شیخ کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ زین الدین مصلے کندھے پر ڈال کر شہر سے نکلے اور برہان الدین غریبؒ کے روضۂ منورہ پر جاکر ٹھیرے اور فرمایا "دیکھیں یہاں سے ہمیں کون اٹھاتا ہے" شیخ کی ثابت قدمی دیکھکر محمد شاہ کے خیالات بدل گئے صدالشریف کو روانہ کرکے معافی مانگی۔ شیخ نے فرمایا اگر بادشاہ شریعت محمدی کا لحاظ کرے اور توبہ کرے اور شراب خانہ اٹھوا دے تو پھر بادشاہ کا کوئی دوست ہم سے زیادہ نہ ہوگا ورنہ کچھ نہیں۔ ہمارا تو یہ نصب العین ہے۔

تا من بزیم بجز نکوئی نکنم　　جز نیک دلی و نیک خوئی نکنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند　　تا دست رسد بجز نکوئی نکنم

یہ سنکر محمد شاہ نے توبہ کرلی اور ممالک محروسہ سے دوکانیں اٹھوا دیں اور بالکل پابند شریعت ہوگیا۔

ابھی محمد شاہ انتظامات سلطنت سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ رایان بیجانگر و تلنگانہ نے قلعجات رائچور، مدگل وغیرہ مطالبہ شروع کیا اور قلعہ کولاس کی واپسی کا مطالبہ بھی ہونے لگا۔ اودھر صرافانِ دکن نے بہمنیہ طلائی اور نقرئی سکوں کو گلانا شروع کردیا سلطنت بیجانگر اور تلنگانہ کے ایلچی مطالبات لیکر گلبرگہ آگئے، محمد شاہ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں ٹھیرالیا۔ گلبرگہ میں ایک خفیہ پارٹی بادشاہ کے خلاف ہوگئی، یہ ایسی افتاد تھی کہ اگر محمد شاہ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پریشان ہوکر بھاگ کھڑا ہوتا مگر محمد شاہ نے نہایت ہی اطمینان سے پہلے تو اپنی مخالف پارٹی توڑ دیا اور پھر تمام صرافوں کو نہایت ہی سختی سے قتل کردیا جب ان چیزوں سے فرصت ہوئی تو دربار عام کرکے ایلچیوں کو طلب کیا اور کہا کہ "رایوں نے اب تک پیشکش و نذرانہ نہیں دیا ہے یہ رقم فوراً داخل خزانہ کردیجائے" ایلچیوں نے بادشاہ کا حکم رایان بیجانگر اور تلنگانہ کو پہونچا دیا اور انہوں نے ایک زبردست لشکر سپہ سالار ناگ دیو اور نانک رام کی سرکردگی میں کولاس روانہ کردیا۔ محمد شاہ نے یہ اطلاع پاکر بہادر خاں بن سمٰعیل مخ کو ایک مختصر سا لشکر دیکر مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ جس نے پہونچکر نہایت ہی جی داری سے مقابلہ کیا اور راجۂ درنگل سے خراج و تحائف لیکر واپس ہوا۔

۷۶۳ھ میں چند سوداگر گھوڑے لارہے تھے جو محمد شاہ نے منگوائے تھے جب وہ ورنگل پہونچے تو ناگ دیو نے چھین لئے اور سوداگروں نے اس کی اطلاع بادشاہ کو دی، اطلاع پاتے ہی محمد شاہ ایک ہزار سوار لیکر بجلی کی طرح ورنگل پہونچ گیا اور قلعہ پر قبضہ کرلیا، ناگ دیو قلعہ سے باہر ایک باغ میں شراب پی کر مست پڑا ہوا تھا۔ محمد شاہی فوج نے اسے گرفتار کرلیا اور قلعہ کے سامنے آگ جلاکر پھونک دیا۔ محمد شاہ نے پندرہ روز تک وہیں ٹھہر کر جشن منایا۔ جب رایانِ تلنگانہ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے تعاقب کیا۔ محمد شاہ لڑتے بھڑتے ہوئے واپس ہونے لگا مگر بہت نقصان اٹھانا پڑا یا زہر گولی کا شدید زخم لگا اور صرف پندرہ سو آدمی گلبرگہ تک پہونچ سکے۔

۷۶۳ھ میں رائے تلنگانہ نے فیروز شاہ دہلی کو لکھا کہ ہم ایکا کر کے آپ کی مدد کرتے ہیں آپ حکام مالوہ اور گجرات کو دکن پر چڑھائی کا حکم دیں مگر فیروز شاہ کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی وہ دکن پر کیا چڑھائی کرتا اس نے جواب نہ دیا مگر جب یہ خبر محمد شاہ کو ملی تو وہ آگ ہو گیا اور اپنے لشکر کے دو حصے کر کے ایک ورنگل اور ایک گولکنڈہ روانہ کر دیا اور دونوں طرف لشکر کامیاب رہا۔ راجۂ ورنگل نے ایک بیش بہا مرصع تخت اندازاً چالیس لاکھ قیمت کا اور بے شمار زر و جواہر دیکر پیچھا چھڑایا اور گولکنڈہ بھی محمد شاہ کے ہاتھ آیا۔ ۷۶۴ھ ۱۳۶۲ء میں ورنگل پر بھی محمد شاہ کا قبضہ ہو گیا اور دریائے کرشنا کا تقریباً کل حصہ سلطنت بہمنیہ میں داخل ہو گیا

۷۶۵ھ میں محمد شاہ اور رائے بیجانگر میں ایک باقاعدہ لڑائی ہوئی جس میں نہ تو مصالح ملکی مدنظر تھے اور نہ کوئی مذہبی خیال تھا صرف محمد شاہ کو اپنے حکم کی تعمیل کرانی منظور تھی، ملا داؤد بیدری جو محمد شاہ کا مہردار تھا اس جنگ کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے،

''ایک روز محمد شاہ بہمنی حلقۂ رقص و سرود میں بیٹھا ہوا تھا کہ قوالوں نے امیر خسرو کے دو شعر گائے جسے محمد شاہ نے بہت پسند کیا اور ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان تین سو قوالوں کو انعام دینے کے لئے ایک برات راجہ بیجانگر کے نام لکھدی جائے۔ ملک سیف الدین نے اسیوقت برات لکھ دی مگر اس خیال سے کہ بادشاہ نے نشہ میں ایسا حکم دیدیا ہے ممکن ہے کہ بعد خیالات بدل جائیں برات روانہ نہیں کی، دوسرے روز بادشاہ نے دریافت کیا برات روانہ کردی گئی'' تو سیف الدین نے جواب دیا نہیں'' یہ امر محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا کہا ''کیا تو خیال کرتا ہے کہ کوئی لغو اور مہمل حکم مابدولت کی زبان سے نکل سکتا ہے ہم نے نشہ میں حکم نہیں دیا بلکہ جو کچھ کہا گیا سمجھ بوجھ کر کہا گیا ہے'' غوری نے فوراً برات پر مہر کی اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ برات بیجانگر روانہ کردی گئی۔

رائے بیجانگر نشۂ حکومت میں چور تھا وہ کسی کو اپنے مقابلہ کا خیال ہی نہیں کرتا تھا حکم کی تعمیل تو اور بات ہے اس نے قاصد سے برات لیکر اس کی تشہیر کی اور گدھے پر بٹھلا کر تمام شہر میں پھرایا اور ذلیل کر کے نکلوا دیا۔ اور تمام فوج ساتھ لیکر بیجانگر سے چل پڑا تیس ہزار سوار، تین ہزار ہاتھی، نو لاکھ پیدل سے قلعہ اوہوتی پر یورش کی اور تمام علاقہ لوٹ لیا۔ اور مدگل پہونچکر قلعہ پر بھی حملہ کردیا۔ یہاں کا داروغہ ملک سیف الدین غوری کا ایک عزیز اور نہایت ہی سخت آدمی تھا، قلعہ پر آٹھ سو جوان محافظت کے لئے تھے مگر داروغہ کی سختی کی وجہ سے بددل تھے، اسی بددلی کی وجہ وہ لوگ مقابلہ نہ کر سکے اور راجہ نے مدگل پر قبضہ کر لیا، تمام باشندے قتل کر دئے گئے حتیٰ کہ زن و مرد میں کوئی باقی نہ رہا صرف ایک مسلمان نہ جانے کہاں چھپ رہا تھا کہ راجہ کے سپاہیوں کی وردی پہن کر مدگل سے نکلا اور گلبرگہ پہونچکر سارا حال کہہ سنایا بادشاہ یہ خبر سنکر آگ ہو گیا اس خبر لانے والے کو یہ کہکر قتل کرا دیا کہ ''میں ایسے منحوس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا جو تمام بہادروں کو کٹتے مرتے دیکھ کر اپنی جان بچا کر بھاگ آئے'' اسی دن جمادی الاول ۷۶۷ھ کو قسم کھائی کہ جب تک آٹھ سو مسلمانوں کے خون کے عوض ایک لاکھ ہندؤں کو قتل نہ کرونگا تلوار نیام نہ کرونگا۔ اور کشت و خون سے ہاتھ نہ روکوں گا'' اسی دن گلبرگہ سے روانہ ہو گیا اور جب رود کرشنا پر پہونچا تو مغلظہ قسم کھائی کہ جب تک خداوند کریم کے فضل و کرم سے دریا عبور کر کے لشکر کفار کو نیست و نابود نہ کرونگا اور مسلمانان مدگل کے خون کا بدلہ لیکر دل نہ ٹھنڈا کروں خواب و خور حرام ہے،'' اپنے بیٹے کو جانشین بنا کر وصیت تک کر دی اور ملک سیف الدین

غوری کو نائب السلطنت مقرر کرکے گلبرگہ روانہ کر دیا اور صرف خاصہ کے بیس ہاتھی اور نو ہزار سوار ساتھ لیکر کرشنا کے پار جا اترا۔

بادشاہ کا حال سنکر رائے بیجانگر کو بہت پریشانی ہوئی اس نے خزانہ وغیرہ روانہ کرکے خود بھی فرار پر قرار کیا، مگر رات میں بارش ہو چکی تھی راستہ خراب تھا بمشکل چار میل ہی گیا ہوگا کہ محمد شاہ لئے ہوئے آ پہونچا اور پہلے ہی حملے میں ستر ہزار زن مرد اور بچے قتل کرئے۔ دو ہزار ہاتھی تین ہزار توپیں اور بندوقیں، سات سو عربی النسل گھوڑے ایک منزل سنگاسن (پالکی) مرصع داخل خزانہ ہوئی اور بقیہ لوٹ امراء اور فوج کو ملی، محمد شاہ نے موسم برسات مدگل ہی میں بسر کیا جب خان محمد دار السلطنت سے فوج لیکر آیا تو اُسے ادہونی روانہ کر دیا اور ہر دیور اے نے اپنے بھانجے کو سپہ سالار بنا کر قلعہ میں چھوڑا۔ اور خود بیجانگر سے فوج ہاتھی اور لوازم شاہی منگوا کر قلعہ کے باہر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے بھی توپیں اور بندوقیں زیادہ تعداد میں منگوائیں اور ایک آتش باری کا نیا کارخانہ قایم کیا جس کا رواج اب تک نہ تھا یہ اسی کی ایجاد تھی مقرب خان سیستانی کو اس کا افسر مقرر کیا اور رومی اور فرنگی سپاہی کا کام کرنے کے لئے مقرر کئے گئے۔

ریاست بیجانگر پر چڑہائی کا یہ بالکل پہلا موقع تھا اس لئے محمد شاہ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا، مگر اسپر بھی محمد شاہ نے تنگ بھدرا کو عبور کرکے تخمیناً پچیس میل آگے بڑھ کر یا کل کوتال پر بیجانگر کی فوج سے مقابل ہوا، کیونکہ محمد شاہ کے دریا پار اُترنے کی اطلاع جب "بکا رائے بیجانگر کو ملی تو اس نے امراء کے مشورے سے بھوج مل کو سپہ سالار مقرر کرکے چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیدل دیکر محمد شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا۔ بھوج مل کو سپہ سالاری کا عہدہ پاکر ایسی مسرت ہوئی کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور راجہ سے پوچھنے لگا" مہاراج کا کیا حکم ہوتا ہے آیا بادشاہ کو زندہ قید کرکے حاضر کروں یا اس کا سر کاٹ کر لاؤں" راجہ نے کہا۔ زندہ دشمن تو ہر حال میں خطرناک ہے بہتر تو یہ ہے کہ تم اس کو جس وقت گرفتار کرو فوراً مار ڈالو" بھوج مل خوشی خوشی روانہ ہوا اور اس نے یہ ایک اور ترکیب سوچ لی کہ چند برہمنوں کو اس واسطے مقرر کر دیا کہ لشکر میں مسلمانوں کے مظالم بیان کرکے سپاہیوں کو جوش میں لائیں۔ برہمن تو مسلمانوں پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے دل کھول کر مسلمانوں کے مظالم بیان کرنے شروع کئے اور ایسے وعظ کئے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں جذبات منافرت کی طغیانی ہونے لگی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ محمد شاہ کو جب بھوج مل کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل خود رکھکر اور دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل اور توپ خانہ دیکر خان محمد کو مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا

پنجشنبہ ۱۴ ذیقعدہ ۷۶۷ھ کی صبح سے مقابلہ شروع ہوا شام تک دونوں فوجیں آپس میں گتھی رہیں عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں میمنہ اور میسرہ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور انکی فوجیں منتشر ہونے لگیں قریب تھا کہ فوج کے قدم اکھڑ نے لگیں کہ بادشاہ خود تین ہزار سوار لیکر پہونچ گیا، محمد شاہ کو دیکھتے ہی خان محمد کی ہمت بندھی اور منتشر شدہ فوج لیکر حملہ کر دیا، مقرب خاں بھی توپ خانہ لیکر آگے بڑہا، تمام افسران فوج نے اکٹھا ہو کر دھاوا کیا۔ ہندو روک نہ سکے اور آپس میں گتھ گئے

دست بدست لڑائی ہونے لگی، اتفاق سے محمد خاں کا ہاتھی "شیر شکار" بدل گیا اور بھاوت کے قبضہ سے نکل کر سیدھے
قلب لشکر میں جا گھسا، بھوج مل کے ہاتھیوں نے روکنا چاہا مگر وہ کب رکتا تھا اسی گڑبڑ میں بھاوت بھی مارا گیا اور
شیر شکار مطلق العناں ہوکر روندنے لگا خان محمد نے بھی پانچ ہزار سوار لیکر قلب پر حملہ کر دیا، شیر شکار بھی اپنے مالک
کو دیکھکر اس کی طرف آیا اور دشمنوں کو پامال کرنے لگا۔ بھوج مل زخمی ہوکر بھاگا اور اس کو بھاگتے دیکھکر لشکر کے قدم
بھی اُکھڑ گئے، محمد شاہ نے قتل عام بول دیا۔ اب کیا تھا مرد تو مرد عورتیں اور بچے بھی تہ تیغ کئے گئے، کامل فتح ہوئی اور محمد شاہ
نے اسی میداں میں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک ہفتہ قیام کرکے آگے بڑھا رائے بیجا نگر باوجود فراوانی لشکر کے ایسا گھبرایا
کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں جھپ گیا محمد شاہ بھی اپنی بات کا دھنی تھا تین مہینہ تک وہ صحراؤں میں پیچھا کرتا رہا، اور راجہ کو گھیر کر
قلعہ کی طرف لایا۔ ایک مہینہ تک راجہ قلعہ بند اور بادشاہ محاصرہ کئے رہا مگر بیٹھے بیٹھے محمد شاہ کو ایک نئی چال سوجھی یعنی ایک
بستر علالت پر دراز ہوگیا اور اپنی شدید علالت کی خبر مشہور کرادی، یہ ایک راز تھا جس سے خان محمد اور مقرب خاں کے
سوائے کوئی واقف نہ تھا۔ رائے بیجا نگر کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور وہ قلعہ کے باہر نکل پڑا، بادشاہ پیچھے ہٹنے لگا
اور راجہ تعاقب کناں ساتھ ہوگیا، بادشاہ سنگھاسن میں لیٹا ہوا سفر کرتا تھا تمام لشکر پریشان ساتھ ساتھ تھا اسیطرح
دریائے تنگبھدرا کو عبور کرکے ایک میدان میں قیام کیا۔ دو تین کوس کے فاصلہ پر راجہ نے بھی ڈیرے ڈال دیئے، راجہ
بالکل بے سروسامانی کے ساتھ شاہی لشکر کو دیتا ہوا آگیا تھا جب محمد شاہ نے دیکھا کہ موقع اچھا ہے تو ایک دن دربار عام کیا
اور دس پندرہ منٹ بیٹھ کر دربار برخواست کر دیا، اس سے فوج میں ہمت آگئی اور رات کے بارہ بجے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا
اور خود بھی تیار ہوکر راجہ کے لشکر پر شبخوں مارا تمام ہندو بے خبر پڑے سو رہے تھے جب مسلمانوں نے سر پر پہونچکر قتل عام
شروع کیا تو یہ بیدار ہوئے مگر مسلمانوں کی تلوار سے پناہ پانی مشکل تھی۔ رائے بیجا نگر تو اپنی جان مٹھی میں لیکر چلتا بنا گر دس ہزار
آدمی کام آئے، اسپر بھی محمد شاہ کا تیش کم نہ ہوا، بیجا نگر کے اطراف چالیس چالیس کوس تک قتل عام کر دیا، دس ہزار برہمن
قتل ہوئے اور قلعہ کے اطراف رعایا کا پتہ نہ رہا اور فوج تو نام کو بھی باقی نہ تھی۔

ادہر ہندو بے انتہا پریشان تھے تمام امرا، وزرا نے اس قتل عام کو رائے بیجا نگر کے سر تھوپا کہ محض تیری وجہ
اور تیری ہی خودسری اور شعلہ مزاجی کے کارن یہ دن دیکھنا نصیب ہوا، ہم نے علاؤالدین سے صلح کرلی تھی تو نے ذرا سی بات
کے واسطے لڑائی مول لی، اب نہ تو تو رہیگا اور نہ سلطنت کا نام و نشاں ہی باقی رہیگا، اب بھی مصالحت کرلے تو اچھا ہے،
اسیوقت راجہ نے ایک ایلچی روانہ کیا اور معذرت سے عفو تقصیر چاہی مگر بادشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ امرا بہمنیہ بھی لڑائی
سے تنگ آگئے تھے ایک پیش رفتہ من چلے امیر نے عرض کی کہ حضرت نے آٹھ سو مسلمانوں کے بدلے میں ایک لاکھ ہندوؤں کو
قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور وہ پوری بھی ہوگئی، اگر یہ قسم نہ تھی کہ روئے زمین پر کے تمام ہندو قتل کئے جائیں گے۔ یہ سنکر
محمد شاہ ہنس پڑا اور کہنے لگا تم سچ کہتے ہو مگر مجھے اپنی بات کی لاج ہے۔ جب تک رائے بیجا نگر میرے حکم کی تعمیل نہ کریگا

اور قوالوں کو رقم نہ دیگا میں مصالحت نہ کرونگا، ایلچی نے فوراً قوالوں کو رقم ادا کردی اور جب محمد شاہ نے قوالوں کو رقم دیجاتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہنے لگا "میں نہیں چاہتا کہ کوئی حکم میری زبان سے ایسا لغو نکلے جس کی تعمیل نہ ہو سکے۔ اور آگے چل کر میری سبکی ہو الحمد للہ میرا حکم پورا ہوا"

محمد شاہ کی اس عدیم النظیر سخن پروری کو ہم بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور ایسا کشت وخون ذرا رکیک ضرور ہے

ایلچیوں کے معروضہ پر بادشاہ نے عہد کیا کہ آئندہ کسی جنگ میں فتح کے بعد کسی ہندو کو قتل نہ کیا جائے گا۔ مگر اس کی پابندی نہ تو خود محمد شاہ نے کی اور نہ اس کے جانشینوں نے چند ہی روز کے بعد یہ عہد بھلا دیا گیا۔

مصالحت کے بعد محمد شاہ گلبرگہ آگیا مگر اس وقت بیجانگر کی حالت بری تھی پانچ لاکھ ہندو تہ تیغ ہو چکے تھے، اور کوسوں تک ویرانا ہی ویرانا نظر آتا تھا مدت تک بیجانگر سنبھل نہ سکا۔

محمد شاہ نے جسوقت اپنی علالت کی خبر اڑائی تو بہرام خاں ماژندرانی نے بغاوت کردی گلبرگہ پہونچکر بادشاہ کو اطلاع ملی تو اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہونے لگا، مگر وہ گجرات بھاگ گیا جس کی وجہ ایک فتنۂ عظیم فرو ہو گیا۔

۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ کو سترہ سال نو مہینے سات دن حکومت کرکے ۴۵ سال کی عمر میں محمد شاہ نے انتقال کیا،

چون محمد شہ زمین وزماں	جست زیں دار دوں بجنت راہ
شاہ ملت بگو باس نیز	اہل دیں مرد دیں محمد شاہ
۷۷۶ھ	۷۷۶ھ

محمد شاہ دشمنوں کے لئے نہایت ہی سخت گیر اور اپنی رعایا اور فوج کے لئے نہایت ہی ذی خلق تھا۔ نہایت ہی عقیل، شجیع فہیم، اولوالعزم، اور عالی حوصلہ تھا۔ ٹھگوں اور ڈاکوؤں کا قلع وقمع کر دیا اس کے زمانہ میں آٹھ ہزار ڈاکو گرفتار کئے جا کر قتل کئے گئے تھے ایک دفعہ سارا خزانہ بیت اللہ کو روانہ کر دیا مگر بعد میں اس کے ہاں اس قدر خزانہ جمع ہوا کہ دوسرے کسی بادشاہ کو اتنی دولت میسر نہ آسکی۔ اس کی اولاد سے ایک بیٹا مجاہد شاہ اور ایک بیٹی روح پرور آغا تھی۔ باقی ——— باقی

تمکین کاظمی

عنایات سے توقع ہے کہ اس بارہ میں "ملاحظات" کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ فرما دیں گے۔

سید محمد قادری بی، اے

صاحب موصوف کی فرمایش ہے کہ میں ملاحظات کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں۔ لیکن چونکہ ملاحظات میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی اس لئے اس مکتوب کو علحدہ درج کرکے، غلط فہمی کا ازالہ تو نہیں البتہ اس امر کی توثیق کرنا چاہتا ہوں کہ اس نسخہ کو حیدرآبادی اڈیشن کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتے۔

آپ نے اول تو یہ بالکل غلط سمجھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے احسن مارہروی ہیں۔ مضمون کے اخیر میں احسن لکھنوی کے الفاظ نہایت صاف صاف درج ہیں، علاوہ اس کے تمہید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کا لکھنے والا وہی ہے جس نے "واقعات انیس" لکھے اور یہ دنیا کو معلوم ہے کہ "واقعات انیس" مارہرہ کی پیداوار نہیں بلکہ لکھنؤ کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ مراثی انیس پر ناقدانہ یا مصححانہ نگاہ ڈالنا مارہرہ، فتحپور یا حیدرآباد کے کسی فرزند کا کام نہیں بلکہ اس کو وہی شخص کرسکتا ہے جو لکھنؤ کی عہد انیس کی زبان و معاشرت سے واقف ہو اور یہ فخر لکھنؤ میں بھی اب صرف چند نفوس کو حاصل ہے۔

جناب "نظامی عفی عنہ" نے اپنے مقدمہ یا تمہید میں جو مراثی انیس جلد اول کے اول میں شامل ہے نہایت کھلے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ:—

> اساتذہ اردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا ان کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اوستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اردو میں قابل اسناد ہیں اس اہمیت کو مدنظر رکھ کر جناب سید اسں مسعود صاحب بی اے (آکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیحضرت قدر قدرت ہز اگزالٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملتہ والدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اردو کے کلام کی اشاعت کے لئے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شائع ہونے کی نوبت آئی اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎
>
> گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی — ضعیفی نے ہم کو جوان کردیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اردو دان پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسن صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدر آباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحبؒ کا اصلی فوٹو عنایت فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری خواہش کو پورا نہ کر سکے انھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں۔

"اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اُن کی آخری عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم مٹیابرج و حیدر آباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کئے۔ یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آسکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جدا کرنے پڑے۔"

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہوگئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ سوہو ہذا۔

اس "ہو ہذا" کے بعد جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس سے ہمیں بحث نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف جناب "نظامی عفی عنہ" کے زور قلم و اجتہاد فکر سے ہے واقعات سے نہیں۔

کیا اس تحریر کے بعد کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ مراثی انیس کا یہ اڈیشن، حیدر آبادی اڈیشن نہیں ہے۔ ریاست نظام کا ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ میں وہاں کے علم و ادب کا نظم و نسق ہے، مراثی انیس کی اشاعت کے لئے ایک

ایک شاہانہ عطیہ کی سفارش کرتا ہے، اعلیحضرت جو فطرتاً علم دوست واقع ہوئے ہیں اس کی ضرورت کو محسوس کرکے اس سفارش کو منظور فرماتے ہیں اور متوسلین حیدرآباد میں سے نظم طباطبائی ایسا شخص جو لکھنؤ کے نہ صرف مخصوص فضلاء و ماہرین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ عہد انیس کے واقعات، حالات، زبان، محاورات اور معاشرت و تمدن سے پوری طرح واقف ہے اس کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دیتا ہے، اور پھر بھی اس پر اصرار ہے کہ اس نسخہ کو حیدرآبادی اڈیشن نہ کہا جائے کیونکہ وہ اغلاط سے لبریز ہے اور اس حقیقت کا اظہار حیدرآباد کی علمی نیک نامی کے لئے مضر ثابت ہوگا۔

کیا ایسی کتاب جس میں روپیہ، سفارش، تصحیح و ترتیب سب حیدرآباد کی ہو اس کو صرف اس بنا پر کہ وہ بدایوں میں طبع ہوئی ہے، حیدرآبادی ہونے سے خارج کر دیتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ حیدرآبادی اڈیشن ہونے کے لئے اور کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کتاب حیدرآباد ہی میں شائع ہوتی تو بھی بہرحال مسعود یار جنگ اور مولانا طباطبائی ہی اس کے مہتمم و مصحح و مرتب ہوتے اور وہی اب بھی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض بدایوں میں چھپنے کی وجہ سے کیوں اس کو حیدرآباد سے "خارج البلد" کیا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب سے اعلیحضرت حضور نظام کی علم پروری یا حیدرآباد کی علمی خدمتوں پر مضر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں تو اب حقایق مسلمہ میں داخل ہیں اور ان سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام کے اس شاہانہ عطیہ کا مصرف بالکل غلط ہوا اور وہ مقصود پورا نہ ہو سکا، جس کو سامنے رکھ کر سفارش کی گئی تھی، اور جس پر اعتماد کرکے اعلیحضرت نے امداد منظور فرمائی تھی۔

میں بہت مسرور ہوا کہ آپ نے یہ خط بھیجکر مجھے موقعہ دیا کہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کروں کیونکہ میرے نزدیک اس وقت تک حیدرآباد کا مراثی انیس کی طرف سے غافل رہنا ایک ایسی فروگزاشت ہے جس کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے، میں نے حیدرآباد کی تخصیص اس لئے کی کہ اس وقت وہی مرکز ہمارے علوم و فنون کا ہے اور وہیں کی شاہانہ فیاضیاں ہمارے ضایعات کی تلافی کر سکتی ہیں۔

اگر آپ اور دیگر حیدرآبادی حضرات کچھ مدد کر سکتے ہوں تو کیجئے۔ میں شوق سے مستقلاً یہ سلسلہ قایم کرنے کے لئے طیار ہوں اور جناب احسن لکھنوی کو بھی آمادہ کرونگا کہ وہ اپنے خاندان کے تمام محفوظ بستوں کو نکال کر جس قدر کلام انیس شایع ہو چکا ہے اس کے ایک ایک نقطہ پر نگاہ ڈال کر صحت کی طرف متوجہ ہوں۔

نظامی پریس کی دوسری جلد مراثی انیس کی ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری، لیکن اگر یہ سلسلہ قائم ہو گیا تو پھر اس کا دیکھنا بھی ناگزیر ہوگا۔ بہرحال آپ کی طرف سے جو امداد اس باب میں ہو سکتی ہے اس سے مطلع فرمائیے تاکہ میں تمام آسانیوں اور دشواریوں پر نگاہ کرکے اس سلسلہ کو شروع کر دوں۔

نیاز فتحپوری

باب الاستفسار

(بعض سیاسی مسایل)

(جناب غلام علی خاں صاحب اٹک)

(۱) نگار برابر دیکھتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں آپ کی محنت کی داد دیدیا کرتا ہوں۔ اگر ناگوار نہ ہو تو ایک رائے پیش کروں اور وہ یہ ہے کہ نگار میں کوئی حصہ سیاسیات کا نہیں ہوتا چونکہ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے اس لئے بہت جی چاہتا ہے کہ مختلف مسائل میں آپ کی رائے بھی معلوم کرتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر مہینے اس میں چند صفحات اس کے لئے الگ کردئے جائیں اور ان میں سیاسی مضامین درج ہوتے رہیں۔ بہرحال اس وقت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کو آپ کیا سمجھتے ہیں، مسایل عدم تعاون، ستیاگرہ، کھدر پوشی اور مجلس خلافت، تبلیغ، مسلم لیگ اور کانگرس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میں آپ کی سیاسی معتقدات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) ایک زمانہ سے یہ مسئلہ میرے سامنے ہے کہ نگار میں کم از کم دس صفحے سیاسی شذرات کے لئے مخصوص ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حصہ بھی استفسارات، معلومات، ملاحظات وغیرہ کی طرح مستقلاً مجھی کو پورا کرنا پڑے گا، اس لئے اس ذمہ داری کو لیتے ہوئے گھبراتا ہوں، اس لئے نہیں کہ محنت سے جی چراتا ہوں، بلکہ محض اس بنا پر کہ وقت کہاں سے لاؤں، آپ یقین کیجئے کہ اخبارات و رسایل پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت مجھے حاصل نہیں ہے، بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی اہل شخص میرے مشاغل کا بار سنبھالنے کے لئے مل ہی جائے گا اور میں آپ کے اس نہایت مفید و ضروری مشورہ پر عمل کر سکوں گا۔

مہاتما گاندھی کو میں اس زمانہ کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں یہاں تک کہ کوئی شخص کوشش و سعی کے باوجود بھی ان کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ ان کی سیاسی تعلیم اس قدر زبردست ہے کہ اگر کوئی جماعت اس پر عمل کر سکے تو اپنے اندر ایک ایسی بے نیازانہ قوت پیدا کر سکتی ہے کہ اس کے سامنے سارے عالم کی مادی قوت سر ڈالنے پر مجبور ہو جائے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کی تقلید آسان کام نہیں اور ایک ملک صد درجہ سیاسی ابتلا سے گزرنے کے بعد ہی اس میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مہاتما جی جس چیز کو اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ غالباً پچاس برس کے بعد قابل عمل ہوگی اور ہر چند اس وقت وہ تو موجود نہ ہوں گے، لیکن ان کی تعلیمات زندہ ہوں گی اور ملک انھیں پر کار بند ہو کر

× گاندھی جی کو دیوی فرشتہ یا پیغمبر تو میں نہیں جو انسان کے مرتبے کو پہنچنا کوئی ایک مشکل امر ہے۔

منزل مقصود تک پہونچ سکیگا۔ عدم تعاون اور ستیاگرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک دوسرے کو مستلزم ہے اور یہی اصل روح گاندھی جی کی تعلیم کی ہے۔ کھدر کے استعمال کی برکتیں ہر شخص پر روشن ہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس سلسلہ میں "دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں" چونکہ ہم لوگ نہایت سطحی تعلیم و تربیت رکھنے والے ہیں اس لئے بعض اوقات بعض نفوس بالکل غلط اثر قبول کرتے ہیں۔ کھدر کے استعمال کا جو اقتصادی فائدہ ہے وہ تو خیر ظاہر ہی ہے لیکن اس میں ایک نوع کی روحانی تعلیم بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو غریبوں کی سطح پر لے آئے اور انکے ساتھ ہمدردی کرے لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے نگاہ کی اور کھدر پوشی حقیقتاً ایک ذریعہ اور عجب و غرور کا بن گیا۔

میرے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ بعض نوجوان اس کا استعمال صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی سفید ملاحت اُن کے گورے رنگ اور داڑھی مونچھ منڈے ہوئے صاف و صبیح چہرہ پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اکابر قوم میں ایسے تو متعدد ہیں جو کھدر پہننے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر انکسار افتادگی پیدا کریں اپنے آپ کو ایسی عظیم و بلند ہستی سمجھنے لگتے ہیں کہ پھر مشکل ہی سے کوئی شخص قابل التفات ان کو نظر آتا ہے اور ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جو ان کو اس لباس میں دیکھکر کوئی ارادتمند "مولانا" کہکر ہاتھ چومنے کے لئے بڑھتا ہے اور یہ ایک ایسے عجز کے ساتھ جس میں فرعون کا غرور پنہاں ہوتا ہے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو شروع کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا نظام انھیں کی ذات پر منحصر ہے اور اگر آج یہ سیادت و قیادت چھوڑ دیں تو شاید نظم عالم درہم برہم ہو جائے۔

یہ لوگ کھدر کے لباس میں بھی قصداً بد ترتیبی اور بھونڈا پن پیدا کرتے ہیں، ارادتاً بے ناپ کے ہوئے بوسیدہ اور میلے کپڑے کھدر کے استعمال کرتے ہیں تاکہ عالم کی طرف سے بے نیازی، لوگوں کی جانب سے بے ہمگی، اور امور دنیا میں ایک خاص قسم کا الھڑپن ظاہر ہو اور اس طرح لوگ ان کی طرف زیادہ مایل ہوں۔

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کھدر پوشوں کی وہ جماعت جو زر البلند تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے اکثر افراد اس عذاب میں مبتلا ہیں اور جس وقت وہ موٹر میں بیٹھکر باہر نکلتے ہیں تو ہر چند بظاہر ان کا ملبوس جس کو قصداً اُنھوں نے تار تار کر دیا ہے، حد درجہ انکسار کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے نفس میں اُس وقت اتنا سخت غرور بھرا ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کسی مستبد حکمراں میں پایا جا سکتا ہے۔ بہرحال کھدر پوشی کا یہ مکروہ و مبغوض پہلو یقیناً سخت لعنت ہے لیکن محض ایسے خود نما و خود فروش مکاروں کی وجہ سے اصولاً اُس کو نہ بُرا کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ترک کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے۔

(۲) مجلس خلافت اب بالکل لایعنی اور بیکار سی انجمن ہے، کیونکہ جب خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اس مصیبت سے عالم اسلامی آزاد ہو گیا تو پھر سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کا پیٹنا کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اب مجلس خلافت سے مقصود صرف ایک ایسی تنظیم کا قایم رکھنا ہے جو مسلمانوں کو ایک شیرازہ سے وابستہ رکھے تو اس کے لئے کوئی اور نام تجویز

کرنا چاہئے موجودہ نام سراسر دھوکا ہے، اگر اس نام کے جواز کے لئے یہ تاویل پیش کی جائے کہ ہر چند مسئلہ خلافت اب باقی نہیں رہا ہے، لیکن حرمین تو موجود ہیں، وہاں کے مسایل سے تو مسلمانوں کو واسطہ ہے تو میں اس کو اصولی غلطی کہونگا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عراق و حجاز، ترکی و ایران وغیرہ کی سیاسیات سے بحث کرنا یا محض سیاسیات خارجہ کے لئے ایک مستقل انجمن قائم کرکے اپنی ملکی سیاسیات کو پس پشت ڈالدینا بالکل خلاف عقل ہے۔ ہر ملک اپنے مصالح کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہماری چیخ پکار سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ اس کو نہیں پہونچتا بلکہ بعض اوقات بُرا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنی ملکی حالت پر غور کرکے اپنے لئے کوئی طریق عمل پیدا کرنا چاہئے اور جب اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر گھر سے باہر کی آگ کو دیکھنا چاہئے۔

مذہبی تنظیم کے لئے بیشک ہر ضلع اور صوبہ میں ایک صدر الاسلام یا شیخ الاسلام کا تقرر ضروری ہے جس کے ہاتھ میں تمام مسایل مذہبی اور خصوصیت کے ساتھ فراہمی و صرف زکوٰۃ کا انتظام ہو۔ سو اس کے لئے مجلس خلافت کے قیام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ از سر نو ایک مذہبی انجمن قائم کرنا لازم ہے۔

مسلم لیگ اس سے زیادہ بے معنی چیز ہے، کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے وہ بیکار محض ہے، اور سیاسیات کے لحاظ سے اس کا کانگرس سے علیحدہ رہنا، گویا مسلمان اور ہندو میں ایک دائمی تفریق کا سبب پیدا کرنا ہے، تبلیغ کے لئے جتنی انجمنیں جہاں قایم ہیں میں ان سب کا سخت مخالف ہوں اور ایسے اخبارات و رسائل کو میں ملک کا شدید ترین دشمن سمجھتا ہوں جو تبلیغ اسلام کا علم بلند کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے اصولی غلطی مسلمانوں سے یہی ہوئی کہ انھوں نے شدھی اور سنگھٹن کے مسئلہ کو اہمیت دی اُن کو صرف سکوت اختیار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے بعض افراد ایسے ہیں جو حصول زر اور جلب منفعت کے لئے ایسی فرصتوں کی جستجو میں رہتے ہیں، اس لئے وہ ایسے زریں موقعہ کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے اُنھوں نے ایک ہنگامہ شدھی کے خلاف پیدا کرکے ہندوستان کی سیاسیات میں اس قدر نزاکت پیدا کردی کہ اب عرصہ تک اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شدھی کے مسئلہ کو چھیڑنا ہندوؤں کی زیادتی اور غلطی ہے، لیکن کسی زیادتی یا غلطی کا جواب ہمیشہ غلطی اور زیادتی ہی سے نہیں دیا جاتا۔

کانگرس ہی صحیح معنے میں ایک سیاسی انجمن ایسی ہے جس میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ یہ عذر کہ اس میں ہندو زیادہ ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں کے بہت سے جائز حقوق کو پامال کر دیتی ہے ناقابل قبول ہے کیونکہ اگر آپ چاہیں تو اپنی قوت و کثرت عزم و انہماک سے اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار بنا سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کو خلافت، تبلیغ وغیرہ کے مہمل قصوں جھگڑوں سے کہاں فرصت ہے کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں، رہ گئے ہمارے رہنما اور ہادی، سو ان کے متعلق سکوت ہی بہتر ہے کیونکہ اگر آج وہی کسی کام کے ہوتے تو یہ بے راہ روی اور مسلمانوں کے انحطاط کی یہ "نغمہ افزونی" کیوں پیدا ہوتی۔

نیاز فتحپوری

قطرۂ اشک

ابر بہار خیمہ زن وادیٔ کوہسار میں! حسن ازل تھا جلوہ گر منظر سبزہ زار میں
غنچۂ دل مہک اٹھا زلفِ سحر کے عطر سے گلشن ناز تھا نہاں بادِ صبا کے پیار میں!
جلوۂ حسن مضطرب موجِ صبا کے عکس میں! وحشتِ عشق بے نقاب دامنِ گل کے تار میں
شوق کا کارواں تھا گم دشتِ سکوتِ صبح میں تا رنگہ گندھا ہوا مہر کے سرخ ہار میں
جنبشِ چشم ملتفت منظرِ عام کی طرف! مقصد دل چھپا ہوا جلوۂ روئے یار میں
دیکھا اٹھا کے جب نقاب بیخودیٔ خروش کا اور ہی کچھ نظر پڑا انجمنِ بہار میں

زلفِ دوتا کھلی ہوئی، عارضِ حسن جلوہ ریز ایک پری کھڑی ہوئی مست کسی خمار میں
چہرہ تھا کچھ اداس سا، آنکھوں میں تھا نشانِ غم دامن اشک تر بستر گریۂ بے قرار میں!
دیکھ کے ہوش اڑ گئے یاس کے اس ہجوم کو! اک گل تر، اور اس طرح صورتِ دلفگار میں!
شوق کی بے حجابیاں، ناز کی بے نیازیاں! ایک ادا تھی پیار کی شرم ستم شعار میں!
چاک کیا حجاب شرم جرأت انکشاف نے! میں نے بڑھایا اک قدم وادیٔ کوہسار میں
عرض کیا کہ "اے پری! کون ہے تو یہ کیا ہے حال کام ہے تیرا کیا بھلا دامن کوہسار میں؟"
اشک امید ابل پڑے چشم الم نواز سے موجِ حیات آگئی بحر امید وار میں

بولی بصد ادا کہ "میں قطرہ ہوں ایک اشک کا سیکڑوں حسرتیں ہیں دفن ایک مرے مزار میں
میں ہوں وہ بارشِ کرم، سبز مرے ہی دم سے ہیں جتنے بھی نونہال ہیں گلشنِ قلبِ زار میں
مجھ سے ہی فیضیاب ہیں تشنہ لبانِ بزمِ غم! میری ہی مے کا ہے اثر چشمِ خمار دار میں

حیف! کہ تیری آنکھ کا ایک بھی قطرہ نم نہیں! سوز نہیں رہا ہے کیا آتشِ روزگار میں
کچھ بھی تجھے ہے پاسِ دل، کچھ بھی تجھے خیال ہے سیکڑوں آبلے ہیں خشک پائے دلِ فگار میں

سیکھ کہیں سے طرزِ غم، ڈھونڈھ کے لا کہیں سے اشک — لطفِ نظارہ کچھ نہیں ورنہ حریمِ یار میں

اتنا کہا اور اڑ گئی، دیکھتے دیکھتے پری — کچھ بھی نہ تھا پھر اس کے بعد دامنِ کوہسار میں
سکتہ سا مجھکو ہوگیا، رہ گیا دل کو تھام کر — قوتِ ضبط پھر کہاں دیدۂ بیقرار میں
فرطِ الم سے گر پڑا، مار کے چیخ خاک پر — شعلۂ روح چھپ گیا برقِ شرارہ بار میں

نظامی بجھرایونی

بصایر

کسی نے ارسطو سے اک روز پوچھا — کہ ہو دوست جاہل تو کیا ہے نتیجا
کہا اس نے جاہل ہے خود اپنا دشمن — وہ کیا دوست ہوگا جہاں میں کسیکا

چلا جاتا تھا افلاطوں سرِ راہ — ہوا اک شخص سائل آکے ناگاہ
کہ زیبا کب تلک ہے کسبِ حکمت — کہا جب تک ہے نازیبا جہالت

اک معلم کو یہ بقراط نے دیکھا اک روز — کہ لیاقت پہ ہے اپنی اسے دعوائے عظیم
جب پڑھاتا ہے تو کرتا ہے سلف پر ایراد — ان کے دعوے نہیں کرتا کسی صورت تسلیم
بولا بقراط کہ بچوں کا پڑھانا ہے عبث — جب یہ حالت ہے تو مردوں کو نہ دیجئے تعلیم

جب ملے یوسفِ صدیق سے یعقوبِ حزیں — پھر بھی رہتے تھے اسیطرح ملول و غمگیں
پوچھا لوگوں نے کہ اب رونے کا باعث کیا ہے — اب تو پہلی سی وہ یوسف کی جدائی ہی نہیں
بولے یعقوب بچھڑنے کا تھا رونا پہلے — اب یہ رونا ہے کہ مل کر نہ بچھڑ جائیں کہیں

آسی

طلسمِ خیال

(۱)

نہ فریب خوردۂ آرزو　　　نہ خرابِ کیفِ نیاز ہوں

نہ ہلاکِ زہرِ وفا ہوں میں　　　نہ شہیدِ خنجرِ ناز ہوں

مجھے حسن و عشق سے کیا غرض　　　کہ بعیدِ ذوقِ مجاز ہوں

نہ محبتوں کے لئے ہوں میں　　　نہ عقیدتوں کے لئے ہوں میں

مگر آج تک نہ یہ کھل سکا

کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۲)

مرا عزم وہم سے دور ہے　　　ہے بلند راہ گزر مری

مرا گھر ہے عرش سے بھی پرے　　　ہو کسی کو خاک خبر مری

جسے قدسیوں نے سنا نہ تھا　　　اسے دیکھتی ہے نظر مری

میں تجلیوں میں مقیم ہوں　　　مجھے ہوش ہے وہ کلیم ہوں

مگر آج تک نہ یہ کھل سکا

کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۳)

کہیں فلسفی کہیں منطقی　　　کہیں اک طبیب لبیب ہوں

مرا لفظ لفظ ہے جاوداں　　　میں وہ لازوال ادیب ہوں

یہ جہاں ہے جس سے بعید تر　　　میں بہت ہی اس سے قریب ہوں

میں "نگار" عرش کا رازداں　　　میں خدائے فرش کا رازداں

مگر آج تک نہ یہ کھل سکا

کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۴)

یہ قلمرو دمسِ خوابگوں مرے جاگنے کا مقام ہے
یہ طلوعِ مہرِ ضیا فشاں مری عظمتوں کا پیام ہے
یہ ستارے اور یہ کائنات مری زندگی کا نظام ہے
مرے دل میں عرش کی عظمتیں ہیں رفیع تر مری وسعتیں
مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۵)

میں تہ زمیں سے ہوں آشنا سرِ آسماں کی خبر مجھے
میں ہر ایک بزم کا رازداں ہے ہر اک جہاں کی خبر مجھے
تری خلوتوں کا شریک ہوں ترے آستاں کی خبر مجھے
تری محفلوں میں گیا ہوں میں
تری منزلوں میں رہا ہوں میں
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

روش صدیقی

عروسِ برشگال

موسمِ گرما سے لب پر جان تھی آئی ہوئی   روئے عالم پر تھی بیدِ ہب مردنی چھائی ہوئی
روحِ انسانی پر آفت اسکی تھی لائی ہوئی   آسماں پر ہر نظر پڑتی تھی للچائی ہوئی
اضطراب انگیز دنیا کی ہر اک تصویر تھی
ذرے ذرے میں جہاں کے خواہش تغیر تھی

ناگہاں دیکھا گیا ابرِ سیہ آتا ہوا   اس طرح دوشِ صبا پر پیچ و خم کھاتا ہوا
جس طرح اُٹھے کوئی بالوں کو بکھراتا ہوا   آمدِ فصلِ بہاری کی کھرج گاتا ہوا
گوہرِ ابرِ کرم ہر سمت بکھرانے لگا
موتیوں سے دامنِ امید بھر جانے لگا

چشمکِ برقِ جہندہ باعثِ فرحت ہوئی   لرزشِ موجِ نسیمِ صبح سے ہمت ہوئی
تشنگی کی شدتوں سے حلق کو فرصت ہوئی   پھر شگفتہ پیکرِ عالم کی ہر صورت ہوئی
آ، بلائیں تیری لیوں اے عروسِ برشگال
اپنی آنکھوں میں جگہ دوں اے عروسِ برشگال

مرحبا اے نازنیں ناظورۂ سحر آفریں   اُف تری شوخی ترے نقش و نگار دل نشیں!!
یہ نگاہِ مست تیری اور چشمِ سرمگیں   دوشِ نازک پر ترے بکھری ہوئی زلفِ عنبریں
ہے ترے دامن میں پنہاں ایک لیلائے بہار
صورتِ مجنوں نہ کیوں عالم ہو شیدائے بہار

پھر نسیمِ صبح کے دامن کو اک جنبش ہوئی   شاخسارِ یاسمیں کو پھر ذرا لرزش ہوئی
لالۂ مے نوش کے قدموں کو بھی لغزش ہوئی   پھول ہنسے کھل گئیں کلیاں مجھے بخشش ہوئی
چشمِ نرگس وا ہوئی تیرے ہی جلووں کے لئے
کھل گئی منقارِ بلبل تیرے نغموں کے لئے

آسماں پر اب نظر آتے ہیں بادل دل کے دل   ہیں نشاط آسودہ سارے دشت و کہسار و جبل
کھل گئے افسردہ دل بھی اس طرح جیسے کنول   میکدے میں ہو گئے میکش صراحی در بغل

پھر پپیہوں کی ہر طرف سے صدا آنے لگی
"پی کہاں" کے بھیس میں بانگِ درا آنے لگی

اودی اودی سی گھٹاؤں کا جو ہے آنچل کہیں　　　تو کہیں بکھرا رہی ہے زلف کوئی نازنیں کو
ابر میں بجلی چمکتی ہے سر چرخِ بریں　　　آ رہی ہے جھینگروں کی بھی صدائے دلنشیں

ساری دریا ہو چکے سرمستِ ریعانِ شباب
یعنی ہے سیل رواں میں جوشِ طوفانِ شباب

آبشاروں کے کناروں پر ہے بگلوں کی قطار　　　مرغ آبی کی چہل پر جانِ آہو ہے نثار
نغمۂ فطرت سے ہیں لبریز سارے کوہسار　　　جس طرف دیکھو پڑے ہیں سیکڑوں پھولوں کے ہار

حسن کی نیرنگیاں اب عشق کے دامن میں ہیں
وصل کی "سرشاریاں" اب دامن گلشن میں ہیں

جاذبِ نظارہ ہے کیا قوس کی رنگیں کماں　　　سرخوش کیف ترنم ہیں طیور خوش بیاں
پھول سے معشوق ہیں زینت دہ باغ جہاں　　　اپنے جامے میں سماتا ہی نہیں ہے باغباں

باصرہ افروز ہیں نیرنگیاں برسات کی
سلسبیل گوش ہیں موسیقیاں برسات کی

پھر لب غنچہ پہ لرزاں ہے شمیم جانفزا　　　باندھتا پھرتا ہے رنگِ گل چمن میں اب ہوا
نغمۂ آبی سے ہے گونجی ہوئی ساری فضا　　　آ رہی ہے آبشاروں سے ترنم کی صدا

بادۂ خوش کیف سے لبریز ہے جامِ بہار
مردہ دل بھی جی اٹھے سن سن کے پیغامِ بہار

رات کو جگنو کی تابش، جیسے آوارہ کرن　　　ہائے یہ افشاں کا عالم، اُف یہ زلفِ پُرشکن
ہے بپا پُرنور تاروں کی فلک پر انجمن　　　کر چکی لیلائے شب زریں قبا پھر زیبِ تن

چرخ نیلی کی جبیں پھر نور افشاں ہو گئی
سیل انجم میں شب دیجور پنہاں ہو گئی

چشمہ و دریا کے ہاتھوں میں چھلکتا جام ہے　　　تشنہ کامانِ ارادت کے لئے پیغام ہے
پینے والے خوش ہیں جاری آج فیض عام ہے　　　انتظارِ روزِ فردا اک خیالِ خام ہے

ابتدائے رنگ و بو کی انتہا ہونے کو ہے
لمحہ لمحہ میری ہستی کا فنا ہونے کو ہے

حافظِ خستہ جگر "ماضی" پہ رکھ اپنی نظر　　حال کی رنگینیوں کو رہن مستقبل نہ کر
آنے والا رنگ ہی اک حرفِ مشروط اگر　　نقطۂ موہوم پر ہوگا ترا کبتک گزر

کل شئیٍ ہالکٌ اک آخری پیغام ہے
عالم ایجاد کا انجام کیا انجام ہے

حافظ غازیپوری

نگہ اپنی اپنی

حیات فخر سے جس کو جناب کہتے ہیں　　ہم اسکو ایک نمود حباب کہتے ہیں
علاجِ تشنہ لبی جسکو آپ سمجھے ہیں　　ہم اس طلسم کو موجِ سراب کہتے ہیں
نگہ میں آپکی جو برگِ سبز ہے قبلہ　　ہمارے حلقہ میں اسکو کتاب کہتے ہیں
رموز میکدۂ دل جناب کیا جانیں　　جہان خیال کو جامِ شراب کہتے ہیں
جنھیں حضور کہے جا رہے ہیں خانہ خراب　　انھیں کو ہم تو جلالت مآب کہتے ہیں
ہے خلق جسکے تصور سے لرزہ براندام　　ہم اُسکو خلدِ حقیقت کا باب کہتے ہیں
عوام چشمۂ فطرت نما کہا کریں لیکن　　امیں زمان و مکاں کو حجاب کہتے ہیں

نگہ بلند و دل ہوشمند میداریم
حقیقتیم و حقیقت پسند میداریم

امین حزیں

غزل

بارہا ہجر میں یوں ہم نے اُنھیں یاد کیا　　جسم کو روح کیا روح کو فریاد کیا
اس لگاوٹ سے نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا　　روح کو کشمکشِ یاس سے آزاد کیا
اس نے اس حسنِ تبسم سے نگاہیں ڈالیں　　سب یہ سمجھے کہ سرِ بزم کچھ ارشاد کیا
میں نے کس دن قفسِ غم سے رہائی چاہی　　میں نے کب شکوۂ بے مہریٔ صیاد کیا
اُس سے پوچھے کوئی آغازِ محبت کے مزے　　جس کے دل کو غمِ انجام نے برباد کیا

بعد مدت کے خط آیا ہے کسی کا ذوقی
خیر اتنا بھی غنیمت ہے کہ اب یاد کیا

ذوقی

ڈائری کا ایک ورق

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اس سے قبل سطح قمر تک پہونچنے کا حال درج ہو چکا ہے۔ اب میں کچھ واقعات و تجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔

کرۂ ارض میں سنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرہ، زمین سے چھوٹا ہو تو وہاں کشش کی کمی کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بھی کم ہو جائے گا، یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہونچنے کے بعد وہ صرف چند سیر کی رہجائیگی۔

جہاز پر بھی اس کا کچھ علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہونچنے پر معلوم ہوئی جس وقت ہمارا جہاز، سوشان کے میدان میں اترا تو اس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھب کھاتی ہوئی نیچے اترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ہمنے ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسانوں سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا، مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کی اُن کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگ کافی ہوتی ہے۔

جب یہ مخلوق چلتی ہے وہ اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے، لیکن سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ مخلوق بالکل چھلاوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جسمیں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علٰحدہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک باریک سی ہڈی کا۔ چونکہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس لئے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی نہایت مختصر سا ہے، کیونکہ صرف رقیق چیزوں پر گزر ہے جن کا فضلہ پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعاء وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی ندارد ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ بننے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جسمیں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں دو رخساروں پر اور دو

پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت کمزور جنس کا فرق بھی اُن میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ سلسلۂ تناسل ان کے ہاں کس طرح قایم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا راز ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے تمام گفتگو سیٹیوں یا اشارات سے ہوتی ہے اور اُن کے جسم کے سنہرے بال جو جا بجا کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ گفتگو کے وقت کھڑے ہوجاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

جسوقت ہمارا جہاز پہونچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی شرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آگئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے۔ کپتان نے جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا، اُس نے کچھ اشارات کی مدد سے، کچھ سیٹیاں بجا بجا کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی اُٹھکر اور طرح طرح کا منھ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہمنے صرف اس قدر محسوس کیا کہ وہ دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہوگا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہوجاؤ، ہماری ہمسفر خاتون کی حالت نہایت خراب تھی، انھوں نے اپنے چہرہ چھپائے تھے اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں۔ میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کرکے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ اور درخت کا پتہ نہیں جا بجا اونچی چٹانیں ضرور ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر، پتھروں پر، چٹانوں کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات (Crystals) مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں، جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اترا تھا، تختۂ گل کے نام سے موسوم تھا، حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں طیور میں صرف ایک چیز بکثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہ دے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کے پر و بازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی اجنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھی ہوئی سردی، آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بجائے گرمی کے اور خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی اور ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص اختلاط ہے اور نہ ایسی منافرت ایک ایک غار میں چار چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب و روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چشموں پر جاکر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جاکر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دلکش مقام ایک تو وہ وسیع حصۂ سمندر ہے جو بالکل خشک ہوگیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے

غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک ان کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے اندر کیا ہے، دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لبریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہو کر ان سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح طیار تھی جس میں چار چار وہی چمگادڑ جتے ہوئے تھے اور ایک چلانیوالا اسی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھکر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اسپر بیٹھنے سے انکار کیا، لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں سیٹیوں، آنکھ کی گردشوں اور ڈراونی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اس کو لیکر اوپر اُڑ گئے۔ میں چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی اثر نہ تھا، اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا، اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹے کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی، میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آ گئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت سروں پر اسی مچھلی کے کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوکدار کرے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرمانروا کے پاس جا رہے تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کملوں، سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ منہ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہو گئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور وادیوں کی شفاف چشموں پر پڑ پڑ کر بیشمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعتہً ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیونکہ یہاں سے اب شاہی محلات کی حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قایم کر رکھا تھا، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف حال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پر پہونچکر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے

نمودار ہوئے، جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی چھت سے سرد پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سرنگ ایک فرلانگ کی تھی اس سے نکل کر پھر ہم روشنی میں آئے لیکن اب چٹانوں کا ناتمناہی سلسلہ سامنے تھا، اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح یکے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر ہم خاص قصر شاہی تک پہونچے جہاں بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ قصر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا جس کے جسم پر بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی مچھلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیانک تھی یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے ہوئے ایک مضغۂ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب ہو کر کھڑے ہوگئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم ادا کیا تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری تھکن دور ہوگئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب وغریب اثرات پنہاں ہیں۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک ہی وضع وصورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہکر صبح کرنی پڑی۔ جب دوسرے دن آفتاب بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر چھینکوں میں بیٹھے اب کی یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے۔ مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہونچے تو یہ چھینکے دفعۃً بہت بلند ہوگئے اور ڈرا لو نے آہستہ سے میرے بازؤں میں چمڑے کے دو پر جو لپٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ چھینکے سے گرنے کے بعد وہ دفعۃً کھلنے شروع ہوئے اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر چکراتے چکراتے دفعۃً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جا کر ٹکرا گیا ہوں ــــــــــــــــــــ

آفتاب بہت بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے اُٹھا رہی تھی، اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں کہ آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سہما جا رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت وسالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ چا پی لوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کرکے آیا ہوں۔

نیاز فتحپوری

اقتباسات و معلومات

قوتِ فکر و اجتہاد کی اعجوبہ نمائیاں

۱۸۶۹ء میں ایک دن صبح کو اک نوجوان خستہ حال، پریشان صورت، نیویارک کے باول اسٹریٹ میں جو سرمایہ داروں اور دولتمندوں کا مشہور بازار ہے، نمودار ہوتا ہے اور ٹیلیگراف کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کمپنی نے خاص اشارات کہربائی مقرر کر رکھے تھے جن کے ذریعہ سے وہ شہر کے بڑے بڑے تاجروں کو گھڑی گھڑی مختلف کمپنیوں کے حصوں اور اوراق مالی کے بھاؤ کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

یہ نوجوان اندر ایک کونہ میں بیٹھا ہوا منیجر کمپنی سے ملاقات کا انتظار کر رہا تھا کہ دفعۃً وہ آلہ جس کے ذریعہ سے خبریں پہونچائی جاتی تھیں بیکار ہو گیا۔ دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ تاجروں کے سیکڑوں خادم گھبرا کر آ گئے اور منیجر بھی پریشان ہو کر اپنے کمرہ سے باہر ہو گیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں یہ نوجوان اس آلہ کے پاس پہونچکر اس کے سقم کو معلوم کر چکا تھا۔

جب منیجر اندر داخل ہوا تو اس نے بڑھ کر کہا کہ میں اس کی خرابی کو دور کر سکتا ہوں۔ منیجر نے خوش ہو کر کہا کہ "درست کرو" اور اس نے فوراً پوری مہارت کے ساتھ اسے کھولا اور جو نقص اس میں پیدا ہو گیا تھا اس کو اسی وقت دور کر دیا۔

منیجر بہت خوش ہوا اور اس کو اندر بلا کر بہت سے سوال کئے۔ جوابات سے وہ بہت خوش ہوا اور ۶۰ گنی ماہوار کے مشاہرہ پر اس کو ملازم رکھ لیا۔

آپ کو معلوم ہے یہ نوجوان کون تھا؟ یہ ٹامس اڈیسن تھا جس نے بعد کو برقی قمقمے، فونوگراف، صور متحرکہ کا آلہ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں ایجاد کیں۔

اڈیسن کو کبھی توقع نہ تھی کہ اسے ایسی جگہ ملجائیگی، وہ بہت خوش ہوا اور اپنے اوقات کا اکثر حصہ تحقیق و تفتیش میں صرف کرنے لگا یہاں تک کہ اس نے اشارات تلغرافی کے چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اڈیسن اس قدر سادہ مزاج تھا کہ جس وقت کمپنی کے پریسیڈنٹ نے اس کو بلایا اور کہا کہ تم کس قیمت میں اپنی ایجادات کو بیچنا چاہتے ہو تو اس نے اپنے جی میں کہا کہ ایک ہزار گنی کہونگا اور ۶۰۰ گنی تک دیدونگا، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں یہ رقم بھی زیادہ نہ ہو اس نے جواب دیا کہ "مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ کمپنی کیا دینا چاہتی ہے تاکہ میں اس پر غور کر دوں" پریسیڈنٹ نے کہا کہ کمپنی آٹھ ہزار گنی دینے کے لئے تیار ہے"

اڈیسن یہ سنکر سخت متحیر ہوا اور یہ سمجھا کہ شاید اس کے کان دھوکا دے رہے ہیں لیکن جب اس کو اس رقم کا چک مل گیا تو اسے یقین ہوا اور اس رقم سے اس نے اور بہت سے آلات خرید کئے اور دوسری ایجادات میں مصروف ہو گیا۔

اڈیسن کے حالات طفلی بھی بہت دلچسپ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت جستجو پسند واقع ہوا تھا۔ جب اس کی عمر ۱۲ سال کی تھی تو کسی نے کان پکڑ کر اس کو اٹھایا جس سے اسے ثقل سماعت ہوگیا۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ اس نے قصداً اسکا علاج نہیں کیا کیونکہ وہ اس طرح زیادہ انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور گرد و پیش کا ہنگامہ اس کی فکر کو اپنی طرف

متوجہ نہیں کرتا۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ پونے سات بجے میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ پہلے صبح کے اخبار دیکھتا ہوں اور پھر ناشتہ کر کے ٹھیک آٹھ بجے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ روزانہ ۴۰ سے لیکر ۷۰ تک ایسے کام ہوتے ہیں جنھیں مجھے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو میں تمام ان مشاغل کی فہرست مرتب کرتا ہوں جو مجھے دوسرے دن انجام دینے ہوتے ہیں اور روزانہ مجھے پچاس تجربے علم الکیمیا علم الکہربا، نور، حرارت، آلات معاون وغیرہ کے کرنے پڑتے ہیں۔

پوچھنے والے نے سوال کیا کہ سب سے زیادہ مشکلات کس تجربہ میں اٹھانا پڑیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے زیادہ زحمت مجھے برقی روشنی کے باب میں اٹھانا پڑی کیونکہ جب میں نے اس تجربہ کو شروع کیا تو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ برقی روشنی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں اس لئے جب میں نے اُس کے متعلق تجربات شروع کئے تو مجھے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی وہ اس قدر ارزاں ہو سکتی ہے یا نہیں کہ ہر شخص اس سے فایدہ اُٹھا سکے۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ جب میں نے ارادہ کیا کہ برقی قمقمہ کے اندر کسی بہترین چیز کی بتی یا ڈورا استعمال کیا جائے تو میں نے ہر قسم کے کوئلہ پر تجربہ کر کے دیکھا اور جب اس سلسلہ میں مجھے بانس کے ریشہ کا خیال آیا تو میں نے جاپان، جنوبی امریکہ وغیرہ تمام مقامات میں جہاں جہاں بانس پایا جاتا ہے خاص آدمی روانہ کئے تاکہ وہاں سے ہر قسم کے بانس کا نمونہ روانہ کریں اور اس طرح ۶ ہزار نمونے میرے پاس جمع ہو گئے اور میں نے ان سب کا تجربہ کیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک بہترین چیز مجھے مل گئی۔ ہر چند اس تجربہ میں بیس ہزار گنی صرف ہوئیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ رقم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

اڈیسن کی کامیابی کا راز اس کی مواظبت عمل ہے، یعنی جب وہ کسی کام میں لگ جاتا ہے تو پھر اس کو ترک نہیں کرتا جب تک کامیاب نہ ہو جائے اور وہ اس کے پیچھے کھانا پینا اور سونا سب ترک کر دیتا ہے۔

اس کا قول ہے کہ تاریکی اور نیند انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور میرا برقی روشنی ایجاد کرنا اسی خیال کی بنا پر تھا کہ اگر اس طرح انسان روزانہ دو گھنٹے بھی زیادہ کام کر سکے گا تو سال میں ۷۳ دن کام کے اور زیادہ مل جائیں گے۔

جب اڈیسن فوتوگراف کی تکمیل میں مشغول تھا تو اس نے ایک گیت کو ۲۵۱۲ مرتبہ سنا یہاں تک کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہو گیا۔ اس کا تجربہ جب بعد کو اس نے اپنے عمال کے سپرد کیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی گیت سنتے سنتے ان کو اختلاج سا پیدا ہونے لگا تھا۔ لیکن ان کو ۵۰۰۰ مرتبہ سننا پڑا اور متواتر پندرہ دن اس میں صرف کرنے پڑے اور وہ بھی اس طرح کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ سونے کو نہ ملتا تھا۔

اڈیسن کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے متجاوز ہو گئی ہے اور اب بھی وہ روزانہ ۹ گھنٹے تجربہ گاہ میں اور ۵ گھنٹے اپنے دار المطالعہ میں صرف کرتا ہے۔

اس وقت وہ ربڑ کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کیونکہ اگر آئندہ جنگ ہوئی جس کا اس کو یقین ہے تو امریکہ کی موجودہ ربڑ ایک

سال سے زیادہ نہ چلیگی اور دوران جنگ میں باہر سے خام ربڑ کا آنا بند ہو جائیگا پھر سالانہ ۴ لاکھ ٹن ربڑ (جو جنگ میں صرف ہوگی) کہاں سے آئے گی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے وہ ہنری فورڈ اور ہاروی ویرسٹون سے بھی ملا جو جو اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا کاروبار کرنے والا ربڑ کا ہے۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ امریکہ میں ربڑ کے درخت اس قدر نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کرکے مطمئن ہو سکیں اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی اور درخت ایسا تلاش کیا جائے جس کے اندر ربڑ کا مادہ پایا جائے اور پھر اس کی کاشت کو وسیع کیا جائے۔

چین و انگلستان

اس وقت ایشیا کے سیاسی مسائل میں چین کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مغرب کو مشرق کی طرف سے جب کسی چیز نے مضطرب رکھا وہ چین ہی کا "زرد خطرہ" تھا اور بحالت موجودہ چین کی بیداری بہت کچھ اس خطرہ کو زندہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کا جغرافی تعلق چین سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ ہمسائگی مشکل سے نصیب ہو سکتی ہے، لیکن جہاں ہماری اور غفلتیں ہیں، وہیں ایک یہ بھی ہے کہ نہ ہم اپنے اس ہمسایہ ملک کے حالات سے واقف ہیں اور نہ وہاں کی سیاسیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ چین کا تعلق انگلستان سے کب اور کیونکر ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں۔

چونکہ چین میں اجنبی لوگوں کی آمد و رفت کبھی ممنوع نہ تھی، اس لئے غیر ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات قدیم تاریخوں میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ۱۳۴۲ء میں غیاث الدین تغلق شاہ ہندوستان کی طرف سے ابن بطوطہ کا وہاں جانا ثابت ہوتا ہے ابن بطوطہ لکھتا ہے:-

"سلطان غیاث الدین تغلق نے مجھے سفیر بنا کر چین روانہ کیا۔ شاہ چین نے اس سے قبل سلطان غیاث الدین کے پاس ۱۰۰ لونڈیاں اور غلام، ۵۰۰ تھان کمخواب کے، ۵ من مشک، پانچ خلعت مرصع بھیجکر سلطان سے اجازت چاہی تھی کہ کوہ قراجیل کے نواح میں ایک مندر بنانے کی اجازت دیجائے۔"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے چین کے حالات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ :- "چین میں بہت امن ہے اور ایک شخص معہ قیمتی سامان کے تنہا سفر کر سکتا ہے اور اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہر منزل پر ایک کاروانسرائے ہے جہاں مسافروں اور انکی سواری کے جانوروں کے قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسافر بعد مغرب پہونچتا ہے تو یہاں کا حاکم آتا ہے اور مسافروں کے نام لکھ کر سرائے کے دروازہ میں قفل ڈال دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ صبح کو پھر آتا ہے اور ہر مسافر کو اسم وار پکارتا ہے اور حالات دریافت کرکے ایک محافظ دستہ قافلہ والوں کے ساتھ متعین کرتا ہے جو دوسری منزل تک پہونچاتا ہے اور وہاں کے حاکم کی رسید حاصل کرتا ہے کہ فلاں قافلہ خیریت سے پہونچ گیا۔ اسی طرح اکثر حصۂ ملک میں

رواج ہے - کاروان سرایوں میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے، خاصکر مرغ اور بط تو کثرت سے ملتی ہیں "

الغرض چین میں غیر ملک والوں کی آمدورفت زمانۂ قدیم سے پائی جاتی ہے البتہ انگلستان سے اس کا سفیرانہ ارتباط اخیر سولھویں صدی میں ملکۂ الزبتھ کے عہد سے پایا جاتا ہے -

اس کے بعد ۱۶۳۳ء میں انگلستان نے چین سے تجارتی تعلقات قایم کرنا چاہے اور ایک بیڑہ کپتان وڈل کی قیادت میں روانہ کیا - یہ بیڑہ جسوقت کنٹن کے بندرگاہ کے قریب پہونچا تو بوگیو کے قلعہ سے گولے سر کئے گئے، لیکن انگریزی بیڑہ کی توپوں نے ان کی توپوں کو خاموش کردیا اور اس طرح یہ بیڑہ کنٹن پہونچا اور وہاں سے شکر اور سونٹھ لیکر واپس آیا - اس کے بعد انگلستان کے بیڑے برابر چین جانے لگے اور ہر مرتبہ یہی زحمت پیدا ہونے لگی آخر کار شاہ چین نے ۱۶۸۵ء میں انگلستان کو بحری تجارت کی اجازت دیدی اور ۱۶۸۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک جہاز روانہ کیا تاکہ کینٹن میں ایک کارخانۂ تجارت قایم کرے اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب تو ہوگئی، لیکن اہل چین ان انگریزوں کے ساتھ جو کنٹن میں بسلسلۂ تجارت مقیم تھے اچھا سلوک نہ کرتے تھے آخر کار ۱۷۹۲ء میں، حکومت انگلستان نے لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین کے پاس روانہ کیا تاکہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور بلاد چین میں انگلستان کا ایک مستقل سفارتخانہ قایم کیا جائے - لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین اپنے حضور میں باریاب تو کیا لیکن کسی سبب کی بنا پر یہ سفارت انگلستان کے کامیاب نہ ہوئی اس کے بعد ۱۸۱۶ء میں لارڈ امہرسٹ سفیر بنا کر بھیجا گیا - جن کشتیوں میں یہ سفارت پایۂ تخت کو لیجائی گئی تھی ان کے جھنڈوں پر لکھا ہوا تھا کہ "یہ سفارت انگلستان کی طرف سے جزیہ لیکر آرہی ہے" اور جس وقت یہ لوگ پایۂ تخت میں پہونچے اسی وقت حاضری کا حکم ہوا، لیکن چونکہ یہ سفارت کے رسمی لباس میں نہ تھا اور اس کے پاس کاغذات بھی نہ تھے اس لئے اس نے انکار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ناکام واپس آیا -

اہل چین تجارتی تعلقات قایم کرنا تو پسند کرتے تھے لیکن وہ چاہتے یہ تھے کہ جو سفیر غیر ملکوں کے آئیں وہ اس طرح ملیں گویا بہت زیردست ہیں اور کم از کم انگلستان اسے منظور نہ کرتا تھا -

جب لارڈ نیپر چین گیا تو اس نے کنٹن کے حاکم سے ملنا چاہا تاکہ اب کوئی جھگڑا تفوق کا پیدا نہ ہو اور یہ ملاقات دو برابر مرتبہ والوں کی سی ملاقات ہو اس ملاقات میں بھی یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ کس کی کرسی کس طرف رکھی جائے بالآخر ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھا دی گئیں تاکہ صدر اور پائیں کا قصہ ہی باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ نیپر مر گیا اور معاملات معلق رہے، یہاں تک کہ افیون کی مشہور جنگ وقوع میں آئی اور چین کا جہاز انگلستان کے جہاز نے غرق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین، برطانیہ کو اپنا مساوی سمجھنے لگا اور برطانوی تجار کو اب کوئی خاص شکایت نہ رہی۔ لیکن چونکہ قوت و جبروت سے حاصل کی ہوئی صلح نفرت و انتقام کے جذبہ کو اور ابھار دیتی ہے اس لئے چین کی یہ خاموشی بالکل عارضی و اجباری تھی اور اس کے اندر ہمیشہ سے یہ اہلیت موجود تھی کہ وہ کسی وقت اپنی اہمیت کو سمجھے اور اجنبی اثرات سے اپنے ملک کو آزاد کرائے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ وہاں حصول آزادی کے لئے ایک ہنگامہ بپا ہے، ایک امریکن کا چشم دید بیان قابل توجہ ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ :-

اب جاکر دنیا کو معلوم ہوا ہے کہ چین بھی زندہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جدید چین، اپنے دماغ اپنے اعصاب کی وجہ سے بہت زیادہ قابل التفات ہے۔

وطنیت کی وہ روح جو اصلی مرکز کنٹن میں پیدا ہوئی تھی اس وقت چین کے دو ثلث حصہ پر قابض ہے اور جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ اس مقام پر پہونچ جائیں گے جہاں . . ہم چینی آبادی کو پہونچنا چاہیئے۔

چین کی وطن پرست جماعت دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی مساوات حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس قدر قوت و عزم کے ساتھ کہ وہ سوائے اپنے کسی اور قوم یا ملک کی رائے سننا ہی نہیں چاہتی اور سارے عالم کا مقابلہ کرنے کیلئے طیار رہے۔ تنظیم میں وہ اس قدر ذوق سلیم کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس سے قبل چین میں کہیں اس کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ جماعت ملک کی انتہائی جنوب سے پیدا ہوئی اور شمالی ملک والوں سے ان کی معیشت و معاشرت بالکل علیحدہ رہی ہے اور ان پر مغربی افکار اور مغربی تجارت کا بہت اثر ہوا ہے۔

اس تحریک کا اصل بانی سن یات سن تھا کینٹن کے قریب اس کا مکان تھا اور فطرتاً دمقراطی (Democrat) تھا، یہ چاہتا تھا کہ چین کی استبدادی حکومت جمہوریت میں تبدیل کیجائے، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ایک ہنگامہ اُس نے اس قسم کا پیدا کیا لیکن رشوت اور عسکری قوت سے اُسے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد سن یات سن نے ۱۹۱۸ء میں بمقام کنٹن ایک مستقل حکومت اپنے نصب العین کے لحاظ سے قایم کی۔ اس کے بعد ۶ سال تک وہ اور زندہ رہا اس دوران میں اس قدر مصائب و تکالیف اس نے برداشت کیں کہ مشکل سے اُس کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی کامیابی اس کو حاصل ہوئی تو یہ کہ اب اس کی موت کے بعد ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کے بوئے ہوئے تخم کو بار آور دیکھنے کا آرزومند ہے۔ چنانچہ اس وقت کنٹن کی حالت اس امید کی کامیابی کا آئینہ ہے کہ وہاں حزب وطنی

نے جو سن یات سن کی نام لیوا ہے کیسا معقول انتظام کیا ہے اور چین کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وہاں کا انتظام کیسا مکمل، کس قدر مہذب و ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔

اس جماعت میں وہی شخص شریک ہوسکتا ہے جو دمقراطیت، وطنیت اور جمہوریت کا حلف اُٹھائے اور پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس وقت تک اس جماعت میں ایک لاکھ سے زاید افراد داخل ہوچکے ہیں۔ یہی جماعت برطانیہ کی سب سے بڑی دشمن تسلیم کی جاتی ہے۔ اور روس کے اثر سے بڑی حد تک متاثر ہے۔

ہرچند اس وقت تک تمام ملک چین میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے بڑے ملک میں اس قدر جلد اس کا امکان ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اب یہ تحریک وہاں کامیاب ہوکر رہیگی اور ہندوستان کی طرح اسپر وہ دور نہیں آئے گا جس کیلئے دوبارہ حشر کی ضرورت ہے۔

کائنات کی شعاعیں اور عناصر کی تخلیق

نور کتنا ہی تیز و شدید ہو لیکن ایک باریک سا ورق کاغذ کا بھی اس کے لئے حجاب ہوجاتا ہے۔ سنہ ۱۸۹۴ء تک یہ حقیقت مسلمہ عام تھی لیکن سنہ ۱۸۹۵ء میں ایک اور شعاع دریافت ہوئی جو نور آفتاب سے زیادہ قوی تھی اور جو گوشت اور لکڑی کے اندر سے بھی نفوذ کرجاتی ہے۔ اس کا نام شعاع رنتجنی ہے۔ یہ شعاع باوجود اس قدر قوی ہونے کے سونا، ہڈی اور سیسہ میں بالکل نفوذ نہیں کرسکتی۔

لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ فضا سے ایک اور شعاع اس قیامت کی پیدا ہوتی ہے جو سیسہ کی ۱۷-انچہ کی موٹی تختی سے سے بھی گزرجاتی ہے۔ یعنی یہ شعاع رنتجنی شعاع سے ۴۰۰ گنا زیادہ قوی ہے۔

اس شعاع کے دریافت میں ایک جرمنی، ایک امریکی اور دو سوئٹزرلینڈ کے دماغ مشترک تھے۔

یہ شعاعیں نہ صرف فضاء ارض سے باہر بلکہ کہکشاں سے بھی پرے جو فضا ہے وہاں سے آتی ہیں۔ اور اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عمل تکوین اب بھی کائنات میں جاری ہے اور وہ دقیق ذرات جو مادہ کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں اب بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

پروفیسر ملکن کا بیان ہے کہ ماوراء نجوم جواہر ہڈروجین اور ہلیوم کے چار عناصر بنتے ہیں۔ آکسیجن جو حیات کے لئے ضروری ہے، مگنیزیم جو روشن ہوجاتی ہے اور جس کی روشنی میں رات کو تصویریں لیجاتی ہیں سلکون جو ریت اور شیشہ کی ترکیب میں داخل ہے اور چوتھے لوہا۔

امریکہ کی آبادی

یکم جولائی کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ میں اس وقت ۱۲۰ ملین (۱۲ کرور) آدمی پائے جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے دس کرور تھی۔ گزشتہ ۸ سال میں ڈیڑھ کرور آبادی بڑھ گئی۔ جس کا بڑا سبب وہاں کا محکمہ حفظان صحت ہے جو شہروں کی صفائی اور امراض کے دور کرنے کی تدابیر میں پوری سعی کرتا ہے اور دوسرا سبب وہاں کی ماؤں کا تعلیم یافتہ ہونا ہے جو بچوں کی پرورش کے اصول کو

جاتی ہیں اور ان کی عمر طبعی تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہیں۔

کتابیں فلم کی صورت میں ڈاکٹر ہونٹی نے جو برقی کمپنی کا مہتم ہے اس نے فلم بنانے کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے تمام کتابیں بجائے کاغذ پر چھپنے کے فلم میں منقوش ہونگی اور جن کا مطالعہ بجائے آنکھ کے کان سے ہوا کرے گا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ وقت کم صرف ہوگا بلکہ دماغ پر بھی زیادہ زور نہ پڑے گا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان کتابی فلموں کی قیمت بھی معمولی کتابوں کی قیمت کی طرح ہوگی اور ہر لاسلکی دکان سے ملسکیں گی۔

کپڑے کے ہوائی جہاز جرمنی کے ایک سائنس داں نے لکڑی اور کپڑے کو مختلف دھاتوں کے پانی میں غسل دیکر فولاد کی طرح مضبوط بنا دینے کے کامیاب تجربات دکھائے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ دھات کے پانی میں غسل دیئے ہوئے کپڑے کو اب ہوائی جہازوں کی تعمیر میں صرف کیا جائیگا اور اس طرح نہایت مضبوط مگر ہلکے ہوائی جہاز تیار ہونے لگیں گے۔ ان میں پٹرول رکھنے کے خانوں کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنا دینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

گرافون کے نئے ریکارڈ گرافون کے نئے ریکارڈ تیار ہوئے ہیں جو بہت باریک ہیں اور اس درجہ ملایم ہیں کہ اگر انہیں لپیٹ کر کسی نلکی میں رکھ لیا جائے تو انھیں کوئی نقصان نہیں پہونچتا یہ ریکارڈ فروخت کے لئے بازار میں آنے والے ہیں۔


نگار

قواعد رسالہ نگار

۱ – رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ – رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت روانہ نکیا جائیگا

۳ – خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جس پر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں

۴ – جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ۱ر کا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ – مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔

۶ – سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو ۲۵ فیصدی کمیشن دیا جائیگا	تین مرتبہ	۲۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۴ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	(۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے	ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر لے ۱۱۰۴ جلد ۱۴ - شمارہ ۴



نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول عمہ

فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴	اکتوبر ۱۹۲۸ء	شمارہ ۴

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں سب سے زیادہ اہمیت جس واقعہ کو میں نے دی تھی وہ لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع تھا جس نے نہرو کمیٹی رپورٹ پہ غور کرکے ایک ایسی صورت پیش کردی تھی کہ اس پر اعتماد کرکے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق اچھی توقعات قائم ہوسکتی تھیں، لیکن اس اجتماع کا متفرق ہونا تھا کہ مخالفت کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں اور غالباً مولانا شوکت علی کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہے کہ سب سے پہلے انھوں ہی نے اس سے اختلاف کیا اور اختلاف بھی اس قدر اہمیت و استبداد کے ساتھ کہ نوبت ذاتیات تک پہونچ گئی۔ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کی تحریریں جو سوال و جواب کی صورت میں شائع ہوچکی ہیں وہ ناظرین نگار کی نگاہوں سے گزر چکی ہونگی اور اس لئے امر مابہ النزاع کو متعین کرنا ان کے لئے بھی دشوار نہ ہوگا ــــ سب سے زیادہ قوت اختلاف اس امر پر صرف کی جارہی ہے کہ پنجاب میں باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے، کیوں نشستوں کی تعیین نہیں کی گئی اور مخلوط انتخاب کیوں روا رکھا گیا۔

مولانا شوکت علی کا پنجاب کے مسئلہ میں اس قدر قوتِ مخالفت صرف کرنا جبکہ خود اہل پنجاب کی کثیر جماعت اس کو تسلیم کرچکی ہے، اگر اس وجہ سے نہیں کہ ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کے ساتھ کچھ ذاتی رنجشیں اور شکایتیں بھی ہیں تو سخت حیرت کا مقام ہے کہ مولانا شوکت علی ایسا شخص جو اپنے آپ کو نہایت ہی غیر خاطی متبع اسلام سمجھتا ہے وہ عہد اسلام کے ان واقعات کو فراموش کردے جب ایک اور سو

کی نسبت سے بھی مسلمان خائف نہ ہوتا تھا اور آج پنجاب کے مسئلہ میں باوجود ہندوؤں کی اقلیت کے ان سے اس درجہ خائف نظر آئے کہ وقار قومی کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ ہم اس سے قبل کبھی یقین نہ کرتے اگر کوئی شخص یہ خبر دیتا کہ مولانا شوکت علی کے اتنے بڑے تن و توش کے اندر بہت ہی چھوٹا دل ودیعت کیا گیا ہے۔

ایک قوم یا جماعت کی ترقی کا اصلی راز اس کے اندر سعی و جستجو، کاوش و مسابقت کے جذبات پیدا کر دینا ہے، اگر آج کوئی جماعت یہ یقین کرے کہ وہ اپنے مدعا کو حاصل کر چکی ہے منزل مقصود تک پہونچ گئی ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کل سر رشتۂ مدعا اسکے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا ہے اور منزل مقصود سے پیچھے ہٹ آنا یقینی ہے۔ اگر آج پنجاب اور سندھ کے مسلمان (اس مخصوص مسئلہ میں) مطمئن ہو جائیں گے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ اپنے اندر کوئی اہلیت نہ پیدا کر سکیں گے اور ان کی وہ ناقابلیت جو باوجود انکی کثرت کے، ہندوؤں کی قلیل جماعت کے مقابلہ میں اُن کو پنجاب میں رعشہ بر اندام بنائے ہوئے ہے علے حالہ قائم رہیگی اور ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اُن پر بند ہو جائیگا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پنجاب و سندھ میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے ہندو اپنی قابلیت و وجاہت، اپنی ثروت و دولت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر آبادی پر بھاری ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی اقلیت کے ساتھ ان کی یہ گراں اہمیت مل کر پلہ کو جھکا دے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آج وہاں مخلوط انتخاب کو ہٹا کر بلحاظ آبادی نشستوں کا تعین کر دیا جائے تو کیا اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے مسلمان بدستور اسی گری ہوئی حالت میں رہیں اور پھر اس کے مقابلہ میں دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جہاں وہ نہ صرف آبادی بلکہ علم و ثروت کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے کم ہیں

ہمارے نزدیک مولانا شوکت علی کی یہ مخالفت بالکل قرین صواب نہیں ہے اور اپنی بے مائگی دنااہلی پر ایک مہر دوام ثبت کر دینا ہے جس طرح ہندو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ وہ مسلمانوں کی موجودگی میں ایک خالص ہندو حکومت ہندوستان میں قائم کر لیں اسیطرح مسلمانوں کی یہ تمنا کہ وہ اپنی اقلیت کو سپر بنا کر ہندوؤں سے تمام اپنے مفید مطلب خواہشات کو تسلیم کرا لیں، ناممکن ہے اگر ہندو ترقی کر رہے ہیں، اگر وہ علم و دولت، فہم و فراست، کے لحاظ سے آگے بڑھے جا رہے ہیں تو مقابلہ کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ ان کا دامن پکڑ کر کھینچئے یا کسی اور سے فریاد کیجئے کہ خدا کے لئے انہیں روکو آگے نہ بڑھنے دو، بلکہ اس کا واحد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ خود جست کر کے ان تک پہونچئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی سعی کیجئے اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے جب مسابقت کے لئے محرکات فراہم رہیں، ورنہ مسلمانوں کی اس نیند کا موت میں تبدیل ہو جانا یقینی ہے۔

خود پنجاب میں اس کے متعلق دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں باہم جس انداز سے مخالفت ہو رہی ہے وہ اس درجہ شرمناک ہے کہ اس کا ذکر کرنا بھی خلاف انسانیت ہے جسکو تحقیق کا شوق ہو وہ زمیندار اور انقلاب کے حال کے پرچوں کو دیکھ لے۔

مسلمان اخباروں میں دہلی کے ہمدرد نے اپنی روش یقیناً قابل تقلید رکھی اور اگر اُس ایک افتتاحیہ کو علیحدہ کر دیا جائے جو عبد الماجد صاحب دریابادی کے خشاردماغ کا نتیجہ تھا تو ہم اس کے طریق عمل کو بہت صاف و مصلحانہ پاتے ہیں۔ جناب عبد الماجد صاحب

دریا بادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب وغریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر "تاریخ تنقید" میں کہیں مل سکے آپ فرماتے ہیں کہ۔

"نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں۔ رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب .... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو و مسلمان اطمینان سے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونک کر فرماتے ہیں کہ:۔

"لیکن اس ۵۰ اصفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آنے پایا ہے مادیت کی اس نقار خانہ میں قوم کی روحانی واخلاقی زندگی کی کہیں بھنک تک نہیں پڑنے پائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد تمام تر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے نہ کہ زمین پر خلافت الٰہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں خدا کا نام، روحانی واخلاقی زندگی خلافت الٰہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پاکر چین بر جبین ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کر سکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج، کھدر، چرخا، کونسل، اسمبلی، اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر اخیر میں مایوس ہو کر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کاشکے عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کر لیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بٹلر پیلس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر انھوں نے جس جلن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک ہمیشہ سے "طالبہا کلاب" میں داخل ہیں، اور ایک دولتمند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک وحسد اسی طرح کیا کرتا ہے سچ ہے۔

ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

حکومت ہند کے سب سے بڑے ایوان کا اجتماع گزشتہ سشن میں قومی نقطۂ نظر سے کافی کامیاب رہا۔ قانون تحفظ عوام (PUBLIC SAFETY BILL) جناب صدر آنریبل پٹیل کے فیصلہ کن ووٹ سے ناکامیاب رہا۔ اگر جناب پٹیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید وہ اس قدر جسارت سے کام نہ لیتا اور یہ قانون منظور ہو کر ایک نیا دروازہ دار وگیر کا کھول دیتا ایک قانون اہل مطابع وصحافت کو شکنجہ میں کسنے کے لئے پیش ہونے والا تھا، لیکن وہ پیش ہی نہ ہو سکا اور اس طرح یہ بلا پھر چند دنوں کے لئے ٹل گئی اور اعتبارات سے بھی یہ سشن کامیاب رہا، کیونکہ صدر اور حکومت کے درمیاں جو شکر رنجی پیدا ہو گئی تھی اس پر حکومت نے

اظہار معذرت کرکے اس قضیہ کو ختم کردیا۔ ڈیلی ٹیلی گراف لندن، اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نامہ نگار نے صدر کی غیر جانبداری کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر انکی نیت پر بھی حملہ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر نے ان نامہ نگاروں کو پریس گیلری سے علیحدہ کردیا۔ ڈائرکٹر کے نمائندے نے جس کو اسمبلی کی کارروائیوں کے متعلق ۱۴ سال کا تجربہ ہے، اول الذکر دونوں نمائندوں کی اس نازیبا حرکت کو بہت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حکومت نے بھی اس باب میں اسمبلی کے صدر سے اتفاق کیا۔

یوپی کونسل کے اجلاس نینی تال کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سائمن کمیشن سے اتحاد عمل کی قرارداد آخر کار منظور کرا ہی لی گئی اور سات آدمیوں کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی جس میں ۴ ہندو، ایک انگلوانڈین اور دو مسلمان ممبر ہیں، مسلمانوں کے دو ممبر خان بہادر حافظ ہدایت حسین اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان ہیں۔

اس قرارداد کی منظوری کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب تک تمام قومی جماعتیں پہلے ایوان کونسل سے احتجاجاً باہر نکل نہیں آئیں اس وقت تک یہ تجویز منظور نہ ہوسکی۔ راجہ جگناتھ بخش سنگھ نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور جو بڑی حد تک اس تحریک کی منظوری کا باعث ہوا اس کا انتقام اس طرح لے لیا گیا کہ راجہ صاحب موصوف پر بے اعتمادی کا نوٹس دیدیا گیا اور وزیر مذکور کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

ممکن ہے کہ یوپی کی حکومت اور اس کی معاون جماعتیں اپنی اس کامیابی پر مسرور ہوں کہ سائمن کمیشن کا "یوسف گم گشتہ" اس طرح پھر ہاتھ آگیا۔ لیکن اہل نظر اس نوع کی کامیابی کو جس میں حقیقتاً وقار انسانی کو قربان کرنا پڑتا ہے، بدترین شکست سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

گزشتہ ماہ میں ہم نے میثاق کیلاگ کا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے مستقبل کے لئے فال نیک بتایا تھا اور خیال تھا کہ شاید اب دنیا چین سے بیٹھ سکے گی، لیکن جب مزید اطلاعات موصول ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حد درجہ ناقص "تعبیر امن" ہے۔ ایک طرف اہل مغرب اس کا عہد بھی کرتے ہیں کہ جنگ نہیں کریں گے اور دوسری طرف اسلحہ سازی کو بھی ترقی دیتے جاتے ہیں۔ اگر حقیقتاً جنگ کا محو کردینا منظور ہوتا تو سب سے پہلے آلات حرب کو دریا برد کرنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ اس میثاق میں برطانیہ و فرانس نے یہ عجیب و غریب شرط رکھی ہے کہ وہ اپنے مستعمرات اور زیر اثر علاقوں کو محفوظ اور محکوم رکھنے کے لئے ہر طرح کی دفاعی جنگ کا حق رکھیں گے اور روس پر بھی حملہ کرسکیں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ لندن، پیرس کا مقابلہ تو کبھی نہ ہوگا لیکن انگلستان اور فرانس میں باہم جنگ ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں مستعمرات رکھتے ہیں اور مستعمرات کی حفاظت کا حق انھیں حاصل ہی ہے، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر ہندوستان کو ڈومینین ہوم رول مل جائے تو بھی وہ "استخوان جنگ" بننے کے حدود سے باہر نہیں ہوتا، یہ ہے ہندوستان کی اہمیت کہ اس وقت دنیا کا کوئی سیاسی معاہدہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ہندوستان کے پوزیشن کو فراموش کردیا جاتا ہو۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

افغانستان کا جواں بخت فرمانروا یوں تو ابتدا جلوس ہی سے اپنی روشن خیالی اور حریت فکر وضمیر کا ثبوت دے رہا تھا، لیکن اب سفر یورپ کے بعد سے جو تیزی اصلاح وترقی میں صرف ہو رہی ہے اُس نے اس وقت تمام یورپ کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً بہت فکر مند بنا رکھا ہے۔

قومی جرگہ یا (NATIONAL ASSEMBLY) کا قیام، ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم کا لازم کر دینا، ملک کو مسلح کرنے کے لئے ہر متنفس پر تین افغانی (کابلی سکہ) کا ٹیکس عاید کرنا، حکام کے القاب موقوف کر دینا، یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی صرف الفاظ "جناب من" (MY DEAR SIR) سے مخاطب کرنا، قدیم افغانی لباس کو مغربی صورت میں تبدیل کرنا، تعدادِ ازدواج کو ممنوع قرار دینا، پردہ کو اُٹھا دینا، ریلوے لائن کا افتتاح، اسلحہ کی خریداری وطیاری، ہوائی جہازوں کی تعمیر، مولویوں اور مذہبی علما، کا اخراج ———— یہ سب وہ روشن علامات ہیں جو بیک وقت افغانستان میں ظاہر ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ جو ایک خاص بات ان سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ کابل میں اس وقت جتنا اثر ماسکو اور بالشویک حکومت کا ہے اتنا لندن اور دہلی کا نہیں۔

برطانیہ نے ہندوستان کی طرح کبھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ مصر میں بھی جمہوریت کے جراثیم پیدا ہو جائیں چنانچہ مرحوم سعد زغلول پاشا جب تک زندہ رہے، برطانیہ کے پہلو میں خار ہی کی طرح کھٹکتے رہے کیونکہ ان کی وطن پرستی زیادہ خطرناک حدود تک پہونچ گئی تھی، ان کے بعد جب مصطفےٰ نحاس پاشا وزیر ہوئے تو بھی وہی خلش باقی رہی اور آخر کار ملک فواد مجبور ہوئے کہ ان کو معزول کر دیں اور محمود پاشا کو رئیس الوزرا مقرر کریں۔

انھوں نے عنان وزارت ہاتھ میں لیتے ہی، پارلیمنٹ کو توڑ دیا، قواعد انتخاب منسوخ کر دئے اور ایک کامل شخصی واستبدادی دورِ حکومت مصر میں شروع ہو گیا لیکن برطانیہ اور ملک فواد کو غالباً زیادہ عرصہ تک اس حالت پر مسرور رہنے کا موقعہ نہ ملیگا، کیونکہ اب اہل مصر میں کافی احساس قومی خودداری کا ہو چکا ہے اور یہ طلسم استبداد بغیر ٹوٹے رہ نہیں سکتا۔

غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور ہوا۔ یعنی احمد زوغو بے جو سکندر ثالث کے لقب سے مملکت البانیہ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔ ہر چند جمہوریت البانیہ کا مملکت البانیہ میں تبدیل ہو جانا کوئی دل خوش کن خبر نہیں ہے، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اب جبکہ ساری دنیا سے سلطنت شخصی کا اقتدار اُٹھتا جا رہا ہے البانیہ کم اس دورِ حکمرانی کی عمر زیادہ طویل نہیں ہو سکتی اور احمد زوغو بے جلد صدر کے درجہ پر پہونچ جائیں گے جو یقیناً سلطان سے زیادہ معزز ہے

کسی قوم کی بیداری کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وسعت نظر اور رواداری ہے، اس لئے اگر ایران کی بیداری کی خبریں

آ رہی ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہاں کی موجودہ حالت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو وہی رواداری اور وسعت نظر ہے، ایران ایک زمانہ تک اپنی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے بدنام رہ چکا ہے اور وہاں کی مذہبیت بہت کچھ ترقی کی حائل رہی ہے، مگر اب وہاں بھی نیا دور شروع ہو رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کا یہ کہنا کہ "اس باغ فدک پر نہ لڑو جو موجود نہیں بلکہ سرزمین ایران کی ترقی کی طرف متوجہ ہو کہ ہمارا باغ فدک یہی ہے" ثابت کرتا ہے کہ مولویوں کا اثر وہاں سے بھی اُٹھ گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن مولویوں کا گروہ ہے جنھوں نے مذہب کا مفہوم صرف اپنی شکم پُری قرار دے رکھا ہے۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس بھی مغربی ہوتا جا رہا ہے اور پردہ اُٹھا دیا گیا۔

ٹرکی کی نہایت تازہ اصلاح جو اس نے اپنے علم و ادب میں کی ہے وہ بجائے عربی حروف کے لاطینی حروف کا اجراء ہے یعنی ترکی زبان لاطینی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام خطوط و نقوش سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور اس پر لاطینی و ترکی، عربی و فارسی چینی و جاپانی کسی خط کا بھی اثر نہیں پڑ سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں بظاہر اس امر کا محرک صرف یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد قدیم کی کوئی چیز باقی رکھنا نہیں چاہتے اور اصول ارتقاء کے اس مسئلہ پر عمل کر رہے ہیں کہ تجدید کیلئے پہلے بالکل صفحۂ سادہ ہو جانا ضروری ہے، بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور، ہمارے نزدیک یہ تغیر کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا اگر کوئی قوم اپنی قومیت کی خصوصیت کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتی تو اس کو دوسری قوم بنکر ترقی کرنے پہ کوئی فخر و ناز بھی نہ ہونا چاہئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سے جمہوریت البانیہ نے احمد زوغو کو اپنا فرمانروا تسلیم کیا ہے اس وقت سے مصطفےٰ کمال پاشا صدر جمہوریہ ترکی بھی اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور شاید وہ بھی اپنی قیصریت کا اعلان کر دیں کیونکہ ان کے پاس بہت سی درخواستیں ایسی پہونچی ہیں جنمیں خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ سلطنت ترکی کو جمہوریت سے نکال کر شخصی سلطنت بنا دیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس خبر کا صحیح ہونا ویسا ہی مشکوک ہے جیسے اور بہت سی خبریں ترکی کے متعلق غلط نکلتی ہیں۔ کیونکہ باوجود صدر ہونے کے بھی مصطفےٰ کمال پاشا حقیقتاً ترکی کے سلطان ہی ہیں اور ان کو بالکل وہی اختیارات حاصل ہیں جو ایک فرمانروا کو ہوا کرتے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے بعد وہ اپنے اختیارات میں کوئی اور اضافہ نہیں کر سکتے۔ رہا یہ امر کہ اس طرح وہ اپنے خاندان میں حکومت کو منتقل کرنا چاہتے ہیں، سو یہ امر مصطفےٰ کمال ایسے روشن دماغ انسان سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی یا کسی اور مستبد حکمراں کی یہ خواہش کس حد تک پوری ہو سکتی ہے جبکہ زمانہ کا سیلاب بڑی سی بڑی مستبد سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کئے ڈالتا ہے۔ بہر حال اگر مصطفےٰ کمال نے اس خیال کو عملی صورت دی تو حکومت ترکی کا اقتدار بہت گھٹ جائیگا اور ان سلطنتوں کی حمایت وہ ہاتھ سے کھو بیٹھے گا جن کا اندیشہ ترکی کی دشمن حکومتوں کو دست آزدرازی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دہلی کے روزنامہ ہمدرد کا جدید دور، نہ صرف ترتیب و ضخامت بلکہ فراہمی مضامین و اخبار کے لحاظ سے بھی بہت اُمید افزا ہے (صفحات کا مواد جس میں علاوہ تازہ ترین خبروں کے مختصر و دلچسپ تنقید مسائل حاضرہ اور مضامین خاصّہ بھی ہوتے ہیں)۔

علی الخصوص ایسی صورت میں کہ مولانا محمد علی اس کو بہت ہی سقیم حالت میں چھوڑ گئے تھے، یقیناً جدید کارکنان ہمدرد کی قابلیت نظم و اہتمام کا کافی ثبوت ہے۔ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کا کوئی اردو روزنامہ ہمدرد سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہے اور اس وقت جبکہ نہ صرف پنجاب بلکہ دہلی میں بھی صحافت کا مقصود صرف غیر شریفانہ انداز تحریر سمجھ لیا گیا ہے، ہمدرد کی یہ متین روش بے انتہا قابل داد ہے۔

معاصر مدینہ کی ادارت میں بھی کچھ تغیر ہوا ہے یعنی اب ہمارے عزیز دوست مولوی نور الرحمن بی اے اڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل جناب بدر جلالی کے زمانہ میں مدینہ نے کافی ترقی کی اور انشار کے لحاظ سے اس نے اچھی شہرت پیدا کی، لیکن سب سے بڑا نقص اس میں یہ تھا کہ وہ صرف مولانا محمد علی اور ہمدرد کی زبان و حلقوم بنا ہوا تھا اور خود اپنی کوئی رائے نہ رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ مولوی نور الرحمن صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس نقص کو دور کیا اور اب معلوم ہونے لگا کہ مدینہ بھی اپنی حیثیت، اپنی رائے، اپنا وجود و معیار علیحدہ رکھتا ہے اور اس کا مدعا صرف "خاک از تودۂ کلاں بردار" نہیں ہے۔

نگارشین پریس میں ایک اور نیا رسالہ "العراقی" چھپنا شروع ہوا ہے جو لار (گورکھپور) سے شائع ہوتا ہے اس کے اڈیٹر ابو المعانی علی احمد ثقفی ہیں، جنھیں تاریخ و انساب اور خصوصیت کے ساتھ اپنی عراقی قوم کی تاریخ پر کافی عبور ہے۔ اس رسالہ کا نام یقیناً یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف عراقی جماعت کے لئے مخصوص ہوگا، لیکن اس کی ترتیب میں ہر طبقہ و جماعت کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ میری نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مضامین پر ایک نگاہ میں بھی ڈال لیتا ہوں۔ ورنہ اس کی ملکیت یا اشاعت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے نمونہ غالباً مفت ملتا ہے جو حضرات دیکھنا چاہیں وہ منیجر العراقی، لار (گورکھپور) سے طلب کریں۔

میں اپنے ان احباب سے حد درجہ محجوب ہوں جن کی کتابوں کا ریویو اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ میں اپنا فرض تو پورا کر چکا ہوں، یعنی ریویو لکھ کر بکس میں محفوظ کر لیا ہے، لیکن چونکہ نگار کے صفحات (باوجودیکہ وہ ۹۶ صفحات پر شائع ہوتا ہے) مجھے ہمیشہ کم نظر آتے ہیں یہاں تک کہ ہر ماہ بعض اہم مضامین روک لینا پڑتے ہیں اس لئے ابتک ریویو کے لئے جگہ نہ نکال سکا۔ آئندہ ماہ میں تمام کتابوں کا تبصرہ شائع کر دینا چاہتا ہوں اور وہ اس طرح کہ کچھ صفحات رسالہ میں بڑھا دوں۔ امید ہے کہ یہ عذر بھی میں کچھ تخفیف پیدا کر دیگا

مجھے فروری ۱۹۲۶ء اور جولائی ۱۹۲۸ء کے نگار کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحب جدا کرنا چاہیں تو منیجر نگار کو لکھیں اور قیمت طے فرمالیں ممنون ہوں گا

نیاز

مارخیم

(فسانہ)

"ہاں، ہمارے ہاں مختلف قسم کے بردے ہیں۔ بعض خریدار ناواقف ہوتے ہیں تو میں اس وقت اُن سے اپنے اس زائد علم کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اور بعض مشتبہ ہوتے ہیں" یہ کہتے ہوئے دوکاندار سے موم بتی کو اس طرح اوپر اُٹھایا کہ جس کی تمام روشنی گاہک کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تو اس وقت میں اپنی اس پہچان کا نفع حاصل کرتا ہوں"

مارخیم ابھی ابھی دن کی روشنی میں گلی سے آیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ابھی تک پوری طرح دوکان کی تاریکی سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ اس لئے اِن چبھتے ہوئے الفاظ پر جبکہ موم بتی کا شعلہ اس کی آنکھوں کے قریب آگیا اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا

دوکاندار ایک نہایت مکروہ اور خوفناک ہنسی ہنسا "تم میرے پاس کرسمس کے دن آئے ہو" اس نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

"اس دن جبکہ تم جانتے ہو۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ دوکان میں نے بند کر رکھی ہے۔ اور یہ اصول بنا رکھا ہے۔ کہ آج کوئی کام نہ ہوگا اس لئے تمہیں اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تمہیں میرے اس وقت کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو میں نے آج حساب کی پڑتال کے لئے مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تمہیں اس طرز عمل کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔ میں نفسیات کا ماہر ہوں اور تم سے کوئی استفسار نہ کرونگا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب کوئی خریدار مجھ سے آنکھیں نہیں ملاتا تو اُسے اس کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے" دوکاندار نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر اسی کاروباری لہجہ میں مگر طنز سے کہنے لگا "تم حسب معمول پھر بیان کر سکتے ہو۔ کہ تم نے مال کہاں سے پایا۔ کیا اب کی بھی یہ تمہارے مرحوم چچا مرحوم کی الماری سے نکلا ہے؟ اس کو چیزوں جمع کرنے کا عجیب شوق تھا"۔

یہ کہکر پستہ قد، گول موں اور زرد رو دوکاندار پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے سنہری چشمہ کے فریم کے اوپر سے مارخیم کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرہ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

"اس دفعہ تم غلطی پر ہو" مارخیم نے کہا "میں بیچنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے پاس اب فروخت کرنے کے لئے نادرات روزگار ختم ہو چکے ہیں۔ اور میرے چچا کی الماری میں چوکھٹا تک باقی نہیں رہا۔ اس دفعہ میرا مدعا صرف ایک دوشیزہ کے لئے کرسمس کا تحفہ خریدنا ہے۔ اور واقعی میں تمہارے اوقات میں ———— حارج ہوا ہوں جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیونکہ کل غفلت سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ اور آج دوپہر کے کھانے پر مجھے یہ تحفہ پیش کرنا ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے"

ایک سکوت طاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوکاندار اس بیان کی صداقت پر غور کر رہا ہے۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک اور گاڑیوں کا نرم شور جو قریب کی شاہراہ سے گزر رہی تھیں۔ اس سکوت کے وقفہ کو پُر کر رہا تھا۔

آخر دوکاندار بولا "بہتر ہے جناب، آپ میرے پرانے گاہک ہیں۔ اور اگر آپ کے لئے واقعی اچھی شادی کرنے کا موقع ہے تو میں اس میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتا، یہ لیجئے۔ یہ خاتون کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہو۔ یہ دستی آئینہ، پندرہویں صدی کا ہو اور ایک اچھے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ خریداروں کے واسطے دینے والے کا نام محفوظ رکھا جاتا ہو کیونکہ وہ بھی آپ کی طرح شریف آدمی ہو۔ جو اپنے چچا کی جائداد کا مالک بنا تھا۔"

دوکاندار یہ کہتا ہوا آئینہ کو الماری سے اٹھانے کے لئے جھکا۔ اور مارخیم کے بدن میں برقی رو کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہوگئے۔ اور ہنگامہ خیز جذبات اس کے چہرہ پر آگئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے آئینہ کو پکڑ لیا۔

"آئینہ؟" اس نے کھانستے ہوئے کہا کیونکہ اس کی آواز گلے میں آکر رک گئی تھی۔ "آئینہ؟ کرسمس کے لئے؟ ہرگز نہیں"

دوکاندار سے استفسار کیا " اور کیوں نہیں؟"

مارخیم نے ناقابل بیان انداز میں دوکاندار کو دیکھا اور کہا "تم مجھ سے پوچھتے ہو۔ کیوں نہیں؟ ذرا اس کو دیکھو اس میں دیکھو اپنے آپ کو دیکھو۔ کیا تم اس کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نہ میں اور نہ کوئی اور آدمی پسند کریگا۔"

دوکاندار نے چونک کر اس طنز کا جواب دیا "تو میرے خیال میں آپ کے تحفہ کے لئے میری دوکان میں کوئی چیز نہ ملیگی۔"

مارخیم بولا "میں تحفہ کے لئے کوئی معقول چیز طلب کرتا ہوں اور تم مجھے یہ دیتے ہو۔ یہ صدیوں کی یادگار۔ گناہوں اور جرموں کی یادگار۔"

دوکاندار نے گاہک کو بغور ملاحظہ کیا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی۔ کہ مارخیم مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا

دوکاندار بولا "مگر اس سے تمہارا مطلب کیا ہو؟"

دوسرے نے جواب دیا "یہ کہ نہ تم کسی سے محبت کرتے ہو نہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟ تم صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہو اور کچھ نہیں؟"

دوکاندار نے ذرا ترشروئی سے جواب دیا "میں تمہیں بتاؤنگا کہ کیا جانتا ہوں" مگر پھر فوراً ہی لہجہ بدل کر قہقہہ لگایا اور کہا "دیکھو یہ تمہاری شادی کا معاملہ ہے اور یقیناً اس دوشیزہ کا جام صحت پیتے رہے ہوگے"

مارخیم نے اُسے روکتے ہوئے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا "کیا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہو؟ مجھے اس کے متعلق بتاؤ"

دوکاندار نے جواب دیا "میں نے؟ کسی سے محبت کی ہو؟ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا۔ اور نہ ان خرافات کے لئے آج میرے پاس وقت ہو۔ تم آئینہ لوگے یا نہیں؟"

مارخیم نے جواب دیا "مگر اس میں جلدی کونسی ہو۔ یہاں کھڑے ہوکر باتیں کرنا نہایت دلخوش کن ہو اور زندگی اتنی قلیل اور محدود ہو کہ میں کسی خوشی کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ہمیں چاہیئے کہ جو کچھ حاصل ہوسکے وہ حاصل کریں اس لئے گپ میں وقت صرف کرنا سب سے بہتر ہے آؤ ہم ایک دوسرے کے متعلق باتیں کریں۔ اور دوئی کا پردہ اٹھادیں اور اپنے راز کو کھول دیں۔ ممکن ہو کہ ہم دونوں دوست بن جائیں؟"

دوکاندار نے کہا "میں صرف یہ کہوں گا۔کہ یا تو سودا خرید ریا دوکان سے باہر چلے جاؤ"
مارخیم نے جواب دیا "بالکل درست تو اچھا مجھے کچھ اور دکھاؤ"
دوکاندار ایک دفعہ پھر آئینہ کو رکھنے کے لئے جھکا۔ مارخیم اس کے قریب ہوگیا۔اس نے اپنا ہاتھ اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈالا۔اور ایک گہرا سانس لیا اس وقت مختلف قسم کے جذبات اس کے چہرہ سے ظاہر ہو رہے تھے۔
"غالباً یہ تمہارے لئے اچھا رہیگا" دوکاندار بولا۔لیکن جب وہ کھڑا ہو رہا تھا تو مارخیم اپنے شکار پر جھپٹا۔خنجر ہوا میں چمکا اور دوکاندار کی پشت میں پیوست ہوگیا۔دوکاندار لڑکھڑا کر گرا۔تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔
مارخیم نعش کی طرف دیکھ رہا تھا۔کمرے پر ایک خاموشی طاری تھی۔موم بتی جل رہی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا "یہ نعش اس وقت تک یہاں رہیگی، جب تک کوئی اس کو ڈھونڈ نہ نکالے۔ڈھونڈھی جائیگی؟ اور پھر تو کیا یہ مردہ گوشت کا ڈھیر کوئی ایسی آواز پیدا کریگا۔جو تمام انگلستان میں گونج اٹھیگی؟ اور دنیا کو تعاقب کی صداؤں سے پُر کردیگی"
یہ خیالات ابھی اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔کہ پہلے ایک۔پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر اسی طرح مختلف گھڑیوں نے مختلف رفتار اور آوازسے دن کے تین بجائے۔اس سنسان کمرہ میں ان آوازوں نے اس کو گھبرا دیا اور اس نے کمرہ میں ٹہلنا شروع کردیا اُس نے کمرے کے آئینوں میں بہت سے عکس دیکھے جو اسے گھور رہے تھے اس کی آنکھیں ان عکسوں کو دیکھتیں اور دل کا راز معلوم کرتیں۔اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑتی اور اسے بُری معلوم ہوتی۔
اور اسی طرح جب وہ ٹہل رہا تھا۔تو اس کو اپنے طریقہ عمل میں ہزاروں نقص نظر آنے لگے۔اس کو چاہئے تھا۔کہ اس سے زیادہ خاموش وقت اس کام کے لئے منتخب کرتا۔اس کو چاہئے تھا کہ جائے واردات سے عدم موجودگی کی شہادت بنالیتا اسے خنجر اس کام کے لئے نہیں استعمال کرنا تھا۔بلکہ دوکاندار کا گلا گھونٹ کر مار دینا تھا۔اس کو ذرا زیادہ دلیر ہونا چاہئے تھا۔اور نوکر کو بھی قتل کر دینا چاہئے تھا غرضکہ اس کو تمام انتظام دوسرے طریقہ پر کرنا چاہئے تھا۔اس اثنا میں زیادہ خوفناک خیال اس کے دماغ میں اس طرح چکر لگانے لگے۔جس طرح کسی ویران جگہ میں چوہے دوڑتے ہیں۔سپاہی کے ہاتھ اسکے کندھے پر پڑیں گے اور اس کا تمام بدن ان کے مَس سے پکڑی ہوئی مچھلی کی طرح مرتعش ہوگا۔عدالت کا کٹہرا۔قید کی کوٹھری پھانسی کا تختہ وغیرہ یہ تمام چیزیں سرعت کے ساتھ اس کے دماغ سے گزرنے لگیں۔اور گلی کے لوگوں کا خوف فوج کی طرح اسپر محاصرہ کئے ہوئے تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ انھوں نے اس لڑائی کی آواز ضرور سنی ہوگی۔اور وہ اب بھی اسطرف کان لگائے ہوں گے۔وہ محسوس کر رہا تھا کہ تمام دنیا بجائے کرسمس منانے کے میزوں کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی وہ رسا بن رہی ہوگی جس سے اُس کو پھانسی دی جانے والی ہو۔کبھی اس کو خیال آتا کہ وہ آواز پیدا کئے بغیر نہیں چل سکتا اور وہ ٹھہر جاتا۔کبھی گھڑیوں کی ٹک ٹک اُسے اتنی بلند معلوم ہوتی کہ وہ کانوں کو بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔کبھی کمرے کی خاموشی اسپر گراں گزرنے لگتی اور وہ زور زور سے اس طرح چلنے لگتا۔گویا کہ ایک کاروباری آدمی اپنے کام میں مصروف ہو۔

یکایک باہر گلی میں سے ایک پُر مذاق آدمی نے ڈنڈے سے دوکان کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار کا نام لیکر پکارا۔ مارخیم کا خون اس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اس نے مردہ کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ وہ بالکل چپ تھا اور تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے تھے۔ وہ خاموشی کے بحر بے پایاں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکا تھا۔ اور اس کا جو نام کسی وقت پکارے جانے پر اس کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ اب اس کے لئے ایک بے معنی حقیقت رکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اس آدمی نے کھٹکھٹانا بند کر دیا اور چلا گیا۔

اب اس کے لئے کام کو ختم کرنے کا موقع تھا۔ اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس نعش سے دور بھاگ جائے لندن کی بیشمار آبادی میں گم ہو جائے۔ ایک آدمی آ چکا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دوسرے کے آنے کا امکان تھا۔ علاوہ اسکے کام کر چکنے کے بعد اس سے فائدہ نہ اٹھانا محض حماقت پر مبنی تھا۔ اب اس کو دولت کی ضرورت تھی جو اس کا منتہائے مدعا تھا اور چابیوں کی جو دولت کا وسیلہ تھیں۔

اُس نے نیم وا دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے روشنی اور راہروؤں کے سائے سنیما کی فلم کی طرح گزر کر سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے اور پھر اُس نے ایک حرکت کی اور مقتول کے نزدیک پہنچ گیا، زندگی کی روح جسم سے مفقود تھی بازو زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن دوہری ہو رہی تھی، مگر پھر بھی مارخیم اس کو چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے شانے پکڑ کر لاش کو اُٹھایا پیٹھ کے بل لٹا دیا۔ لاش بالکل ہلکی اور نرم تھی۔ بازو اس طرح زمین پر پڑے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ سے اندرونی جذبہ کی کوئی علامت ہویدا نہ تھی مگر موم کی طرح زرد تھا۔ اور داہنی کنپٹی خون سے لتھڑی ہوئی تھی جو مارخیم کے لئے اذیت دہ تھی۔ وہ ایک لحہ کیلئے لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جرم کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہی ڈھانچہ ہر ایک جذبہ کا حامل تھا اور اب اس کی زندگی کی مشین اسی طرح قایم کر دیگئی تھی جس طرح کہ ایک گھڑی ساز گھڑی کو انگلی سے بند کر دیتا ہے۔

آخر کار ان خیالات کو دماغ سے نکال کر اس نے چابیوں کو تلاش کیا۔ اور دوکان کے کھلے دروازہ کیطرف بڑھا باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور جب مارخیم دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پھر ارادہ کو مضبوط کرکے دروازہ کھول دیا۔

مدہم اور دھندلی روشنی فرش پر پڑنے لگی۔ بارش کا شور اتنا زیادہ تھا۔ کہ مارخیم کو اس میں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قدموں کی چاپ، فاصلہ پر سپاہیوں کا چلنا۔ روپیہ کے گنتے کی آواز مینہ کے گرنے کے ساتھ اسکو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ مکان اکیلا نہیں۔ ہر طرف سے اسپر موجودات کا رعب چھایا ہوا تھا۔ وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر بہت سے لوگوں کو چلتے سن رہا تھا۔ اور جب وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو اسکے آگے اور قدم بھی نہایت خاموشی سے چڑھ رہے تھے۔ اور پیچھے سے اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بہرا ہوتا اور اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہتا۔ اس کا سر اس کی گردن پر ہر طرف بار بار حرکت کرتا اور آنکھیں ہر سمت

جلدی جلدی بھریں۔ سیڑھی کے چوبیس زینے اس کے لئے چوبیس عذاب تھے۔

پہلی منزل پر تین دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جو اس کو تین توپوں کے دہانے نظر آرہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ کاش اپنے گھر کی دیواروں میں محصور ہوتا۔ اور بستر کے اندر تمام کائنات سے علیحدہ ہوکر چھپ جاتا۔ وہ قدرت کے انتقام سے خائف تھا کہ مبادا اس کے جرم کے لئے کوئی شہادت مہیا کردے یعنی ہوسکتا ہے کہ ٹھوس دیواریں منور اور شفاف بن کر اس کے جرم کو فاش کردیں۔ ہوسکتا ہے کہ مضبوط تختے اس کے پاؤں تلے سے نکل جائیں اور اس کو گرفتار کرلیں ان توہمات سے وہ خائف تھا۔ اور درحقیقت یہی اوہام خدا کا انتقام کہلاتا ہے۔ مگر وہ خدا کی طرف سے مطمئن تھا۔ کیونکہ اس کے عذر ایسے تھے جو خود اچھا تھا۔ اور جو انصاف پر مبنی تھے۔

جب وہ گول کمرہ میں بحفاظت پہنچ گیا۔ اور دروازہ بند کرچکا۔ تو سابق خطرات کے خیال نے اس کو پھر گھیر لیا کمرہ سامان آرائش سے خالی تھا۔ فرش کوئی نہ تھا۔ تصویریں جو کھونٹوں کے بغیر دیوار پر الٹی لٹک رہی تھیں مختلف بوسیدہ الماریاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ مارخیم نے الماری میں ایک ایک کنجی لگانا شروع کی۔ یہ نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور ہوسکتا تھا کہ الماری خالی ہو۔ مگر اس کی مصروفیت نے اس کو مطمئن رکھا۔ باہر گلی میں مینہ کی آواز اب اسے غیر معمولی معلوم نہ ہورہی تھی۔ ایک طرف سے پیانو کی سریلی اور دلکش آواز آرہی تھی، بچے گلی میں دوڑ رہے تھے اور گرجا سے پادری کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

الغرض وہ یوں مصروف بیٹھا ہوا تھا کہ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور وہ یکایک گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کا خون رگوں میں منجمد ہوگیا۔ ایک آدمی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ کھٹ سے دروازہ کی چٹخنی کھلی اور پٹ کھل گئے خوف سے مارخیم کا دم خشک ہو رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ کہ آنے والا کون ہے۔ کیا اسی مردہ نے چلنا شروع کردیا ہے یا پولیس کے آدمی ہیں۔ یا کوئی اتفاقی گواہ ہے۔ جو اس کو پھانسی پر لٹکانے کے لئے آرہا ہے۔ مگر جب ایک آدمی دروازے کے اندر داخل ہوکر دوستانہ انداز میں ہنسا۔ اور اندر داخل ہوکر اس نے دروازہ بند کردیا تو مارخیم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اسکی طرف متوجہ ہوا

"کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے"! اس نے نہایت دلخوش کن لہجہ میں سوال کیا

مارخیم کھڑا ہوگیا۔ اور تعجب آمیز انداز میں اس کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی آنکھیں اس کو دھوکا دے رہی تھیں مگر نہیں وہ پوری جسامت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بعض دفعہ اس کو شک ہونے لگتا کہ وہ کوئی ارضی ہستی نہیں معلوم ہوتی مگر پھر وہ عام آدمیوں کی طرح اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اور اس نے پھر عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کیا "کیا آپ دولت تلاش کررہے ہیں؟"

مارخیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں مطلع کرتا ہوں - کہ مالک مکان کی ملازمہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے، اور جلدی یہاں پہنچ جائیگی - اگر تم یہاں پائے گئے تو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے"!

"تو کیا تم مجھے جانتے ہو؟" قاتل نے سوال کیا

آنے والے نے ہنستے ہوئے جواب دیا "آپ مجھے مدت سے عزیز ہیں، اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی مدد کروں"

مارخیم چلایا "تم کون ہو؟ .... شیطان؟"

دوسرے نے جواب دیا "میری شخصیت اس خدمت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی - جو میں آپ کے لئے انجام دینے والا ہوں"

مارخیم نے جواب دیا "ڈال سکتی ہو ڈالتی ہے - کیا میں تم سے مدد لوں؟ نہیں ہرگز نہیں - تم سے نہیں - تم مجھے نہیں جانتے خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے -"

آنے والے نے جواب دیا "میں تمہیں جانتا ہوں - میں تمہیں باطن تک جانتا ہوں"

مارخیم چلایا "مجھے جانتے ہو؟ ایسا کون ہو سکتا ہے میری زندگی خود مجھ پر عیاں نہیں - میں ہمیشہ اپنی نطرت کو دھوکا دیتا رہا ہوں تمام آدمی ایسا کرتے ہیں - تمام آدمی اس پردے سے بہتر ہوتے ہیں جس میں وہ بظاہر لپیٹے ہوئے نظر آتے ہیں انہیں زندگی ہر طرف کھینچے پھرتی ہے - اگر ان کو اپنے آپ پر قابو ہو - اور اگر تم ان کے چہرے دیکھ سکو تو تم ان کو مختلف پاؤگے اور وہ تمام پیغمبر نبی اور قائد ہوں گے - میں گناہوں سے لدا ہوا ہوں لیکن میری پاس ان کے لئے نہیں جنکو خدا جانتا ہے، پھر اگر مجھے موقعہ ملے تو میں سب کچھ ظاہر کر دوں"

"مجھ پر؟" آنے والے نے استفسار کیا -

قاتل نے جواب دیا "میرا خیال تھا - تم نہایت طباع ہو - میں سمجھتا تھا کہ چونکہ تم یہاں موجود ہو اس لئے میرے دل کا راز سمجھ لوگے - مگر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگانا چاہتے ہو! - خیال کرو کہ میرے اعمال کیا ہو سکتے ہیں - میں دیوؤں میں پیدا ہوا - اور دیوؤں میں زندگی بسر کرتا رہا ہوں - حالات کے دیوؤں میں اور پھر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگاتے ہو؟ کیا تم میرا باطن نہیں دیکھ سکتے؟ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجھے گناہ سے نفرت ہے؟ کیا تم میرے صاف ضمیر کو نہیں دیکھ سکتے جس پر گناہ کی سیاہی کا کوئی دھبہ نہیں؟"

جواب ملا "تم نے اپنے جذبات نہایت اچھی طرح بیان کئے ہیں مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یہ نکات میری عقل سے بالاتر ہیں - مجھے اس کی پرواہ نہیں - کہ تم نے کن حالات کے زیر اثر کیا کیا - بہر حال تم راہ راست سے بھٹک رہے ہو مگر وقت گزر رہا ہے - اور ملازمہ نے دیر لگا دی ہے - مگر وہ قریب آرہی ہے اور اس کا قریب آنا تمہارے لئے پھانسی کا قریب آنا ہے - کیا میں تمہاری مدد کروں! تمہیں بتاؤں کہ دولت کہاں رکھی ہے؟"

مارخیم نے سوال کیا "اس کا عوض کیا ہوگا"

دوسرے نے جواب دیا "میں اپنی خدمت کرسمس کے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں"

مارخیم بولا" نہیں میں تمہاری مدد بالکل نہ لونگا۔خواہ میں پیاس سے مرجاؤں۔میں اس جام سے پانی نہیں پیونگا جسکو تمہارے ہاتھ میرے لبوں کیساتھ لگائیں۔میں انکار کرنے کی ہمت کو برقرار رکھونگا۔خواہ تم اس کا یقین نہ کرو۔مگر میں کہے دیتا ہوں کہ میں گناہ نہیں کرونگا"

آنے والے نے طنزاً کہا" قریب الموت آدمی کا اپنے گناہ پر افسوس کرنا کوئی بات نہیں"

مارخیم نے جواب دیا" کیونکہ تم اس کے اثر کا یقین نہیں رکھتے"

دوسرے نے کہا" میں اسکو اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔یعنی جب زندگی ختم ہوجاتی ہے تو میرا کام ختم ہوجاتا ہے۔آدمی میری خدمت کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔مذہب کو خراب کرنے کے لئے اور گیہوں کے کھیت میں کانس بونے کے لئے۔مگر جب وہ مرنے لگتا ہے تو صرف ایک کام کرسکتا ہے یعنی اپنے گناہوں پر افسوس اور اس طرح مسرور ہونا چاہتا ہے۔میں جابرہتیں ہوں۔مجھے آزماؤ میری مدد قبول کرو۔اور اپنی زندگی کے باقی لمحات اچھی طرح گزارو۔میں ابھی ایک مرنے والے کے پاس سے آرہا ہوں۔اس کا کمرہ دوستوں سے پُر تھا۔جو اس کے آخری الفاظ سن رہے تھے۔مگر جب میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا جو رحم کے خلاف چقماق کی طرح سخت تھا۔تو وہ ہنس رہا تھا۔کیونکہ اس نے بھی مرتے وقت خدا سے صلح کرلی تھی"

مارخیم نے کہا" اور کیا تم مجھے بھی ویسا ہی سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے دل میں گناہ کرنے کے سوا اور کوئی جذبات نہیں؟ میرا دل اس خیال پر اچھل رہا ہے۔کیا فطرتِ انسانی کے متعلق تجربہ نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟ اور کیا قتل کا عمل اتنا بُرا ہے کہ نیکی کو اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کہہ دیا جائے؟"

دوسرے نے جواب دیا" قتل میرے لئے کوئی مخصوص گناہ نہیں۔تمام گناہ اسیطرح قتل کے برابر ہیں۔لیکن میں گناہ کا تعاقب کرتا ہوں اور اس کی تکمیل کے بعد تک اس کو دیکھتا رہتا ہوں۔میں نیکی کا بھی تعاقب کرتا ہوں اور یہ حقیقت مجھے اب معلوم ہوئی ہے۔کہ گناہ اور نیکی میں میں ناخن بھر کا فرق نہیں۔ہر ایک موت کے فرشتہ کے لئے درانتی ہے۔گناہ جس کے لئے میں زندہ ہوں۔اعمال میں نہیں پایا جاتا۔بلکہ ضمیر میں۔مجھے گنہگار آدمی عزیز ہے نہ کہ گناہ کا عمل جس کے نتائج بعض اوقات کسی پیغمبر کے عمل سے بھی بہتر ہوسکتے ہیں۔اور میں تمہاری مدد اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے دوکاندار کو قتل کیا ہے۔بلکہ تم مارخیم ہو"

مارخیم نے جواب دیا" میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھدونگا۔یہ جرم جو تم نے دیکھا ہے میرا آخری جرم ہے اس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے ہیں یعنی یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ مجھے نہ کرنا چاہئے تھا۔اس جرم کا سبب میری غربت تھی۔بعض انسانوں میں ایسے صفات ہوتے ہیں۔جو اُن کو ایسا کام نہیں کرنے دیتیں مگر وہ مجھ میں نہ تھیں میں خوشی کا بھوکا تھا۔اور اس لئے میں نے یہ کام کیا۔مگر آج اس جرم کے بعد مجھ میں اور حوصلہ کی طاقت عود کرآئی ہے جو مجھے پھر مارخیم بنادیگی۔میں پھر آزاد آدمی ہوں۔میں اپنے آپ کو تبدیل کیا ہوا پاتا ہوں۔اب یہ ہاتھ صرف نیکی کے لئے استعمال ہوں گے اور اس دل میں صرف نیکی کا خیال ہوگا"

آنے والے نے کہا "تو تم یہ روپیہ اسٹاک ایکسچینج پر استعمال کروگے۔ جہاں تم قبل ازیں کئی ہزار روپیہ ضائع کر چکے ہو"
مارخیم نے کہا "مگر اس دفعہ منافع یقینی ہے"
دوسرے نے کہا "مگر اس دفعہ تم پھر ضائع کردوگے"
مارخیم بولا "مگر نصف میں اپنے پاس رکھونگا"
جواب ملا "تم وہ بھی ضائع کردوگے"

مارخیم کی پیشانی پر پسینہ کے سفید سفید قطرات چمکنے لگے "تو پھر کیا ہوا" وہ بولا "فرض کرو میں سب کچھ ضائع کردونگا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ میں پھر پنجۂ افلاس میں گرفتار ہوجاؤنگا اور دوبارہ پھر یہی کوشش ہوگی جتیٰ کہ میں بہتر ہوجاؤنگا مجھ میں نیکی اور بدی دونوں کا مادہ موجود ہے۔ جو کہ مجھے دونوں طرف کشاں کشاں لئے پھرتا ہے۔ میں ایک چیز کی محبت نہیں کرتا بلکہ سب کی، میں غریب پر ترس کھاتا ہوں اور کسی امیر کی مخلصانہ ہنسی کو روا رکھتا ہوں۔ اور اس کو دل سے چاہتا ہوں کیا تمہارا خیال ہے کہ میری زندگی کی ناخمہ اصرف میری بدطینتی ہے؟ اور کیا میری صفات حسنہ ہمیشہ خوابیدہ رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں"۔

آنے والے نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "مگر تم کو دنیا میں آئے ہوئے چھتیس سال ہوچکے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ تم دن بدن گر رہے ہو۔ پندرہ سال ہوئے جب تم چوری کے نام سے گھبراتے تھے۔ تین سال ہوئے تم قتل کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب کوئی ایسا جرم یا کوئی ایسا کمینہ فعل ہے جس سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہو؟ تم دن بدن نیچے اور نیچے کی طرف جارہے ہو اور تمہاری اس رجعت کو موت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا"۔

مارخیم بولا "یہ بالکل صحیح۔ میں نے کسی حد تک بدی کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر ایک انسان ایسا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اچھے آدمی ماحول کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں"۔

دوسرے نے روکتے ہوئے کہا "میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کے جواب پر میں تمہارے اخلاق کی کیفیت بتاؤنگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کسی گناہ میں کامیاب ہوکر اپنے آپ کو سدھار سکے ہو؟"

"کسی گناہ میں!" مارخیم نے مضطرب لہجہ میں دہرایا "نہیں میں ہر دفعہ نیچے ہی نیچے جاتا رہا ہوں"۔

دوسرے نے جواب دیا "تو پھر تسلی رکھو۔ تم کبھی تبدیل نہیں ہوسکتے۔ اور تمہارے خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتے"
مارخیم دیر تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ آنے والے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "تو پھر کیا" مارخیم بولا "اور عزت؟"

دوسرے نے جواب دیا "کیا تم اس کو بارہا پہلے نہیں آزما چکے؟ تین سال گزرے جبکہ میں نے تم کو گرجا میں اقرار گناہ کرتے ہوئے تلافی کے لئے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ کیا ہی تمہاری آواز سب سے زیادہ بلند نہیں تھی؟"

اس موقعہ پر دروازہ کی گھنٹی بجی اور آنے والے نے فوراً ناصحانہ انداز بدلتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا " ماما واپس آگئی ہے - جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے اطلاع دی تھی - کہ وہ آنے والی ہے - اب تمہارے لئے ایک اور راستہ کھلا ہے - اور وہ یہ کہ تم ماما کو اندر داخل کرو - اور کہو کہ اس کا مالک بیمار ہے - دیکھو کسی طرح کا خوف یا اضطراب تمہارے چہرہ سے ظاہر نہ ہونے پائے - اور جب لڑکی اندر داخل ہو جائے - تو پھر اس کے ساتھ اسی مہارت تامہ کے ساتھ وہی سلوک کرو - جو اس کے مالک کے ساتھ کیا گیا ہے - اور اس طرح سے تمہارا آخری خطرہ ختم ہو جائیگا - اس کے بعد تم اپنی خوشی سے دوکان لوٹ سکتے ہو - یہ خطرہ کے پردہ میں تمہارے لئے مدد ہے - جلدی کرو" وہ چلایا " دوست جلدی کرو - تمہاری زندگی اس وقت ترازو کے پلڑوں میں تل رہی ہے - جلدی کرو اور اس پر عمل کرو"

مارخیم نے نہایت نرمی سے جواب دیا " اگر میری قسمت میں برے کام کرنا ہی لکھے ہیں تو کوئی کام نہ کرونگا گو جیسا کہ تم کہتے ہو - کبھی میں چھوٹے سے چھوٹا رزیل کام کرنے کے لئے طیار ہو جاتا تھا - مگر اب ان سب سے مخلصی پانے کے لئے میں کچھ نہ کرونگا - مجھ میں گو نیکی کی محبت فنا ہو چکی ہے مگر ابھی تک بدی کی نفرت زائل نہیں ہوئی"

آنے والے کی ہیئت میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی - اس کے نقوش مدہم پڑ گئے - اور آہستہ آہستہ وہ غائب ہو گیا - مگر مارخیم نے اسے دیکھنے یا اس پر سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی - کیونکہ وہ کچھ سوچتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا - جہاں نعش کے قریب موم بتی جل رہی تھی - دوکان پر ایک ہیبت ناک سکوت طاری تھا - وہ رکا اور مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے - اتنے میں پھر گھنٹی بڑے زور سے بجی -

اس نے ہنستے ہوئے ماما کا خیر مقدم کیا اور بولا " بہتر ہوگا کہ تم پولیس کو بلا لاؤ کیونکہ میں نے تمہارے مالک کو قتل کر دیا ہے"

ملک محمد باقر

(اسٹیونس)

"غالب بے نقاب" کے حجابات

اور

جناب "آرگس" کے تنقیدی مغالطات

بست بہ خندہ مرامی کشد چہ بد بختم
کہ داد خوے اجل بخت من مسیحا را

لب یار کی جنبش میں مسیحائی، تبسم میں دلربائی، ادب لطیف کی یہ نازک خیالیاں سنا کرتا تھا لیکن درد دل رکھنے والے خندۂ یار میں جس کی مسیحائی کے وہ مقر بھی ہیں، اجل کا سامان پا رہے ہیں، نہیں معلوم یہ خندہ، خندۂ استہزا ہے، یا خندۂ طنز، جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں شاعر کے لئے ہلاکت اور بربادی کا سامان ضرور موجود ہے۔

شیراز کا ایک نوجوان بلکہ جوانا مرگ، دسویں صدی میں یہ تخیل عالم کے سامنے پیش کرتا ہے، دو سو برس گزرنے کے بعد، غالب نے عرفی کی اس نزاکت ذوق پر توجہ کی ہو یا نہ ہو، لیکن، چودھویں صدی میں یہ شعر غالب کی طرف سے ایک فریاد کی صورت میں ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیوں اور کیسے؟ سطور ذیل اس کا جواب ہیں۔

جناب آرگس کی طبعی لطافت، آپ کی کثرت مطالعہ، آپ کا ذوق کاوش "نگار" کے ارباب مطالعہ سے مزید تعارف کا محتاج نہیں، ساتھ ہی یہ بھی اعتراف ہے کہ جناب ممدوح، کسی نہ کسی انقلاب انگیز تنقیدی نظریہ پر اپنی علمی کوششوں کی بھینٹ چڑھانے کی جد و جہد کیا کرتے ہیں، اس شورش میں ملک وطن کا کوئی طبقہ، مدح و تحسین کا ہدیہ پیش کرتا ہے اور کوئی سب و شتم کا، میں ان دونوں سے جدا گوشۂ عزلت میں بیٹھا جناب آرگس کی اس ہنگامہ رائی کا بعض اوقات سرور آفریں، لیکن اکثر "نظارۂ ملال آگیں" کرتا ہوں، آج بے اختیار غالب کا یہ شعر ورد زبان ہے،

خون ہے دل خاک میں احوال بتان پر یعنی　　ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

افسوس جو فیاض عاشق، ناخن یار کی محتاجی حنا پر، گوشہ لحد میں خون بہانے کی تمنا رکھتا ہو، اب زمانہ کی شورش، یا ارباب علم کی مخالفانہ تنقید پر جسے "ناخن حنا شدہ" سے زیادہ تعبیر نہیں کر سکتے، قبر کے اندر خون بہائے یا نہ بہائے، لیکن اس کے جذبۂ دل کی سحر آفرینی قلوب پر اثر کر چکی، اور ارباب نظر و فکر جانتے ہیں کہ مرزا کی ہستی، اس الزام سے کس قدر پاک تھی،

جناب آرگس کا مضمون "غالب بے نقاب" جو فروری ۲۸ء کے نگار میں شائع ہوا ہے، اور جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہے کہ غالب نے متقدمین کے کلام سے اکثر سرقہ کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ ارباب علم وادب کی نگاہ سے گزر چکا ہے اور اور بعض حضرات نے اس پر تنقید بھی کی ہے، لیکن جس طرح جناب آرگس کا مضمون عصبیت سے خالی نہ تھا اسی طرح اس کا جواب بھی معقول نہیں لکھا گیا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں جناب آرگس کے خیالات پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے۔ لیکن چونکہ تنقیدی مضامین، اکثر ناخوشگوارانہ تعلق کا باعث ہو جایا کرتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے جناب آرگس سے اپنی ناموزونیت طبع کے چند نشتر زنی کی معافی چاہونگا، میں ایک طالب علم ہوں، اور مجھے اپنی علمی زندگی کے مرحلۂ اولین ہی میں تنقیدی خیالات کی ترجمانی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ جان اسٹوارٹ بلیکی، جو اڈنبرا یونیورسٹی میں یونانی زبان کا پروفیسر تھا، اپنی عالمانہ تصنیف "تربیت نفسی" (سلف کلچر) میں لکھتا ہے "سب سے بڑی چیز جو ایک نوجوان کے لئے زینۂ تربیت میں ہو سکتی ہے، وہ اس کا ذوق تنقید ہے یہ مسئلہ ایک تجربہ کار ضعیف العمر شخص کے لئے موزوں ہے، لیکن ایک وابستۂ امید نوجوان سے اس کا وقوع بالکل بے محل ہے" تاہم میں یہ ناروا جسارت کرتا ہوں۔ اور "چشم عفو میدارم"

جناب آرگس ایک جگہ فرماتے ہیں "مگر تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب دیکھنے والا دیکھتا ہے، کہ اس دریا کے اکثر چشمے، مستعار، اور اس بحر ناپیدا کنار کے بہت سے موتی حاصل دریوزہ گری ہیں" دوسری جگہ فرماتے ہیں "میری تمہید مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ میں غالب کے شعروں کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں میرا مقصود یہ نہیں ہے" تیسری جگہ لکھتے ہیں "یہ دیکھکر کہ غالب کے یہاں بہت سے مضامین دوسروں کے یہاں سے لئے گئے ہیں ایک مبصر کی نظر سب سے پہلے سرقہ اور توارد کی بحث پر جاتی ہے؟"

میں نہیں کہہ سکتا کہ سطور بالا میں کس حد تک مغالطۂ منطقی سے کام لیا گیا ہے جو چیز "حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار" ہو اور دریوزہ گر، اور مستعیر نے اسے اپنی جائز حاصل کردہ ملکیت بتائی ہو، تو اسے صریح سرقہ نہیں کہینگے تو اور کیا کہیں گے؟ اب فاضل مضمون نگار کی یہ نکتہ سنجی کہ "میں حد سرقہ میں لانا نہیں چاہتا" بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، پس میں یونان کے مشہور خطیب سوفقلس کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ "اگر کلام غالب حاصل دریوزہ گری، اور "مستعار" ہے تو شاعر پر الزام سرقہ صحیح، اور اگر سرقہ نہیں ہے (جیسا کہ فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں) تو اس کے لئے حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار" کے ناموزوں مصطلحات بھی فضول ہیں۔ ارباب فکر "حاصل دریوزہ گری" مستعار اور سرقہ کے ترادف سے انکار نہیں کر سکتے، جناب آرگس نے توارد اور سرقہ کی نامکمل بحث پیدا کر کے، غالب پر مخفی طور سے الزام سرقہ لگانے میں جس ناکام کوشش سے کام لیا ہے اس کا علم بادنی تامل ہر شخص کو ہو سکتا ہے۔ کیونکہ خود انہیں کے بیان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں توارد زیادہ ہے اور یہ کوئی عیب نہیں، میرے سامنے نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی الحسنی، کے "مجمع الصنائع" کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو بلاغت شاعری کے متعلق فارسی زبان میں گیارہویں صدی کی مستند تصنیف ہے، اس نے توارد، اور سرقہ کے متعلق مکمل اور تشفی بخش بحث کی ہے، توارد کے متعلق لکھتے ہیں، "حکم بہ اخذ سرقہ نہ باید نمود، تا معلوم نہ بود کہ شاعر دوم از شاعر اول بردہ، ور، ہنگام انشا، شعر اورا بہ خاطر داشتہ، والا می

تواند بود کہ از قبیل توارد خاطرہا باشد، یعنی بہ ذہن شاعر اول خطور کند، بحسب اتفاق بہ ذہن این ہم خطور کردہ باشد" اس کے بعد مصنف نے توارد کی مختلف مثالیں پیش کی ہیں، جن کے متعلق بعد میں تفصیل سے بحث کرونگا۔

بحث سرقہ سب سے پہلے مجھے بتانا ہے کہ سرقہ کی کتنی قسمیں ہیں، اور یہ کہ جب کلام غالب کو توارد کے احاطہ میں نہیں لایا جاتا، تو حاصل دریوزہ گری کہنا، الزام سرقہ لگانے کے بالکل برابر ہے

سرقۂ شعری یہ ہے کہ کوئی شاعر دوسرے شاعر کے شعر یا مضمون کو اپنی طرف منسوب کرے، اگر دو شاعروں کا کلام عام معنی میں متوارد ہو۔ مثلاً خد کی تشبیہ گل سے، اور قد کی تشبیہ سرو سے، تو یہ سرقہ نہیں، مصطلحات شاعری میں سرقہ جسے کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، سرقۂ ظاہر، اور سرقۂ غیر ظاہر، اور ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں،

سرقۂ ظاہری کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی کا شعر اس طرح اپنی طرف منسوب کر لیا جائے، کہ نہ تو اس میں لفظی و معنوی تغیر ہو، نہ ترتیبی، سرقہ کے اس طریق کو نسخ اور انتحال سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع لکھتے ہیں" در سنہ ہزار و پنجاہ و شش ہجری، .... کمترین با پدر بزرگوار در رکاب بادشاہزادہ عالی مقدار مراد بخش جہان و جہانیاں بودیم، شبے در بلخ بہ مجلس مذکور شعری شد، مولانا عبد اللہ نام جوانے، این دو بیت حسن رفیع را بے ہیچ تغیرے بنام خود خواند ؎

سبزہ از مژگان من سرمشق شادابی گرفت نرگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد اشکم را بزور از مردم چشمم ربود گرد گردم کہ باج از مردم آبی گرفت

سرقۂ ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کا شعر تمام و کمال لے لیا جائے، یا اس کے بعض الفاظ لئے جائیں اور بعض الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ لے آئے جائیں:-

میر معزی کہتے ہیں ؎

مردم بہ شہر خویش ندارد بسے خطر گوہر بکان خویش ندارد بسے بہا

حکیم انوری کہتے ہیں ؎

بہ شہر خویش دروں بے خطر بود مردم بکان خویش درون بے بہا بود گوہر

سرقۂ ظاہری کی تیسری قسم یہ ہے کہ شعر کا مفہوم لے لیا جائے، اور الفاظ بالکل بدل دئے جائیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

من نگویم کہ ابر مانندی کہ نہ نیک آید از خردمندی او ہمی بخشد وہمی گرید تو ہمی بخشی وہمی خندی

مولانا محمود خوارزمی کہتے ہیں ؎

گفتن کہ دست تست بہ وقت سخا سحاب مدحیست در نہایت ایجاز و اختصار

او گرید وبہ عنف دہد چند قطرۂ تو خندی وبہ لطف کنی بذل بیشمار

سرقۂ ظاہر کے اسی اخیر طریق کو "اغارہ، اور مسخ" سے تعبیر کرتے ہیں،

سرقہ غیر ظاہر کی پہلی قسم یہ ہے کہ مضمون شعر مشابہ ہو، چنانچہ عربی میں حریر کہتا ہے ؎

فلا یمنعک ارباب بجاھم سوای ذوالعمامة والخمار

ابی طیب کہتے ہیں ؎

ومن فی کفہ منھم قناة لمن فی کفہ منھم خضاب

اسیطرح فارسی میں رودکی کا یہ شعر ہے ؎

ہر کہ با محنت گزشت از روزگار ہیچ ناموز ز ہیچ آموزگار

ابو شکور کہتا ہے ؎

مگر پیش، پیش آیدت روزگار کہ بہ زد نیابی تو آموزگار

سرقہ غیر ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی کے شعر کا مضمون لیکر اسے دوسرے معنی اور لباس میں پیش کیا جائے مختاری کہتا ہے

کجا خدمت زقبائے دریدہ دوختہ چستر کنو بباید چستر ش دریدہ دوخت قبا

رضی نیشاپوری نے اسی کو مدحیہ لباس میں یوں پیش کیا ؎

بعزم خدمت درگاہ تو بہ ہر طرفے بسا ملوک کہ از تاج می زنند کمر

سرقہ غیر ظاہر کی تیسری قسم یہ ہے، کہ شاعر کسی شعر کے معنی کو الٹ دے، اور اس کے خلاف ظاہر کرے، چنانچہ امیر معزی کہتے ہیں ؎

آن زلف مشکبار بران روئے چون بہار گر کوتہ است کوتہی از وے عجب مدار
شب در بہار میل کند سوئے کوتہی آن زلف چون شب آمد وآن روئے چون بہار

امیر خسرو فرماتے ہیں ؎

اوست نوروز من وچون آمدش جعد بہ پائے راست با روز برابر شدن شب نگرید

ارباب بلاغت کے نزدیک سرقہ غیر ظاہر کی اکثر قسمیں مقبول ہیں، اور سرقہ کے جمیع اقسام میں اگر دوسرا شعر، عذوبت، اور حسن ترکیب میں پہلے شعر سے بڑھا ہو تو متقدمین کے تخیل اور حسن بیان پر یہ معنی آفرینی علم بلاغت کے نزدیک بجائے خود مقبول و حسن ہے، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع فرماتے ہیں "درجمیع اقسام سرقہ اگر شعر دوم بہتر باشد از اول در سلاست، عذوبت و حسن ترکیب آن مقبول و حسن می شمارند" چنانچہ اس کی مثال میں مصنف حکیم ارزقی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

صدف زبیم یلاں در شود بہ کام نہنگ ز خون بر ناسِ یواقیت کردہ لال

لیکن حکیم انوری نے اسی کو ایک غریب اور دلکش اسلوب سے یوں کہا ؎

قہر تو گر طلایہ بدریا بر د شود در دانہ صمیم حلق صدف دانہ انار

اور اگر لطافت و پاکیزگی میں دوسرا شعر پہلے شعر کے برابر بھی ہو، جب بھی مذموم نہیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ؎

بہ قد گفتمی سرو نیست در میانہ قبا | بروئے گفتمی ماہست بر نہادہ کلاہ

چوں ماہ بود، چوں سرو لیکن ماہ بو نہ سرو | مگر نہ بند د سرد، دکلہ ندارد ماہ

اسی کے مقابلہ میں رشید وطواط کا یہ قطعہ پیش کیا جاتا ہے ؎

بہ ماہ و سرد از انت نمی کنم تشبیہ | کہ ایں سخن بر عاقلان خطا باشد

توئی چو ماہ اگر ماہ را کلہ بودے | توئی چو سرو، اگر سرو را قبا باشد

اور اگر کسی کا شعر متقدمین میں سے کسی کے شعر سے نفاست کلام، حسن ادا، اور علو تخیل میں گھٹا ہوا ہو تو یہ بلاغت میں معیوب ہے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ آیا غالب کے اشعار متقدمین کے اشعار سے کم درجہ میں ہیں یا برابر اور بڑھے ہوئے ہیں جناب آرگس نے جتنے اشعار مثال میں پیش کئے ہیں ان میں کوئی شعر متقدمین کے اشعار سے گرا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اگر برابر ہے تو یہ بلاغت میں معیوب نہیں، اور اگر بڑھا ہوا ہے، تو کوئی اعتراض نہیں۔

ایک اور امر قابل گزارش ہے، وہ یہ کہ میری جانکاہی اور کدوکاوش کے بعد بھی، کہیں جناب آرگس ایک مختصر جملہ میں عذر نہ کریں کہ میں نے دعوی ہی نہیں کیا کہ غالب کے اشعار میں سرقہ ہے، میں نے جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے اس نظریہ کی تردید کی تھی کہ "مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے، اور کہیں سے مستعار نہیں" مگر جناب آرگس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا، چونکہ انکو ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کے بیان پر ردوقدح کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ کلام غالب کو احاطہ توارد سے الگ کرنا اور حاصل "دریوزہ گری" کا الزام لگانا اسلئے جناب آرگس کو کسی طرح گریز کا موقع ہی نہیں، پس اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کلام غالب میں سرقہ ہے، تو کیا انوری، خسرو، رضی، ابوشکور تمامی اکابر شعرائے ایران وہند کے کلام میں سرقہ ہے؟ آپ کہیں گے ان کے کلام میں سرقہ نہیں توارد ہے۔ میں کہتا ہوں، آپ غالب کے اشعار کو بھی توارد کے احاطہ میں کیوں نہیں لاتے مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں "مستعار" اور "حاصل دریوزہ گری" کا جو الزام آپ نے لگایا ہے، وہ بے معنی ہو جائیگا۔

توارد آپنے توارد کے سلسلۂ بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملیگا، جو دو شاعروں کے یہاں متوارد ہو۔ اور معروف ومشہور نہ ہو"؟ میں کہتا ہوں توارد کے لئے یہ تخصیص کیسی؟ توارد کی مثال میں پچاسوں اشعار ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو مضامین والفاظ کے اعتبار سے دو شاعروں (بلکہ متعدد شعرا) کے یہاں متوارد ہیں اور پھر بھی معروف نہیں، جناب آرگس کا اول یہ دعوی ہی بے بنیاد ہے چونکہ نہ توکوئی ایسی جامع کتاب موجود ہے، جس میں تمام شعراء متوارد کلام جمع کر دئے گئے ہوں، اور نہ معروف کہے جانے کے لئے کوئی کلیہ ہے اسلئے اگر "معروف" سے یہی مطلب ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگ جانتے ہوں، تو میں سوال کرتا ہوں، امثلۂ بالا میں، انوری، خسرو، رضی وغیرہ کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ فیصدی کتنے عام خواندہ اصحاب کو یاد یا معلوم ہیں، اگر معلوم نہیں ہیں تو انہیں آپ توارد کہینگے یا سرقہ؟ پس یہ بات ثابت

ہوگئی کہ توارد کے لئے معروف و مشہور ہونا لازمی نہیں،

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کا جتنا کلام آپ نے متقدمین کے کلام سے ملتا ہوا قرار دیا ہے، وہ توارد، اور صرف توارد کا نتیجہ ہے۔ کمال الدین اسمٰعیل فرماتے ہیں ؎

مگر توارد خاطر کہ در مجازی آن — نہ ممکن است کہ کس معترض شود بروے

دو راہ رو کہ براہے روند در یک سمت — عجب نہ باشد اگر او فتند پے در پے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں، اور ان کے خیال میں ایسا توارد ہوتا ہے، کہ جو مضمون پیدا ہوتا ہے، وہ معنی اور الفاظ دونوں اعتبار سے باہم ملجاتا ہے، چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ خلاصۃ الاخبار میں موجود ہے۔ ایک بار میر نظام الدین نے 'مرزا سلطان احمد سمرقندی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اور اصلاح کے لئے میر نظام الدین علی شیر کے پاس لائے۔ موصوف نے کسی قدر غور و فکر کے بعد کہا، کہ جو بیت ممدوح کے نام پر مشتمل ہے اس کے بعد دوسرا بیت چاہیئے تاکہ کلام میں ربط پیدا ہوجائے، میر نظام الدین نے التماس کی کہ آپ ہی کہدیجئے، علی شیر نے جواب دیا تم بھی فکر کرو، میں بھی غور کرتا ہوں، دونوں کاغذ، قلم، دوات لیکر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں دونوں نے ایک ایک بیت کہا، اور لکھکر ایک دوسرے کو دیا، دیکھتے ہیں تو دونوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ تھا وہ بیت یہ ہے، ؎

بہار باغ جوانی، نہال گلشن عدل — گل ریاض کرم، سرو جوئبار وفا

صاحب مجمع الصنائع، میر محمد باقر نامی ایک شخص کا بیان نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے، میرے چچا نے ایک غزل کہی تھی، دس سال کے بعد میں نے شیخ فیضی کے دیوان میں اس غزل کا مطلع بعینہٖ لکھا دیکھا، وہ مطلع یہ ہے ؎

عالم ز آب دیدۂ ماتم گرفتہ است — طوفان اشک ماست کہ عالم گرفتہ است

توارد و سرقہ کی نسبت

توارد، اور سرقہ میں امتیاز، خود شاعر کی زندگی کے واقعات سے ہوسکتا ہے، جب ایک عامی شخص ایک شعر کہتا ہے، اگر نفاست اور حسن ادا کے لحاظ سے یہ کسی متقدم شاعر سے مل جاتا ہے، تو اس پر سرقہ کا الزام لگا سکتے ہیں، لیکن ایسا ہی شعر جب حکیم انوری، حکیم ارزقی کے مقابلہ میں، اور خسرو، امیر معزی کے مقابلہ میں کہتے ہیں، تو ارباب بلاغت اسے سرقہ کی بجائے توارد سے تعبیر کرتے ہیں، پس معلوم ہوا سرقہ اور توارد دونوں اعتباری مصطلحات ہیں جنھیں سخن آفرینوں کے واقعات زندگی، ان کے مایۂ علم، اور رتبہ شاعری کے لحاظ سے چسپاں کیا جاسکتا ہے

اب یہاں غالب کی زندگی پر ایک مختصر تبصرہ کی ضرورت ہے، تیرہویں صدی میں ذوق، غالب، مومن ہندوستان کے شعرائے باکمال ہونے کے ساتھ ہی، فضلائے عصر بھی تھے، چنانچہ جب انگریزی حکومت کو کالج کے لئے ایک فارسی دان علامہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ارباب انتخاب کی نظریں غالب اور مومن ہی پر پڑتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، عوام میں غالب کی علمی استعداد متعارف اور مسلمہ تھی۔

اسی طرح غالب ایسا غیور، اور وحدت پسند دل لیکر آیا تھا کہ ۱۲۴۵ھ میں جب ایک شخص متخلص بہ اسد کا حال سنا، تو فوراً اسد تخلص ترک کر دیا، اور "غالب" اختیار کیا، سرقہ تو کجا، غالب کو توارد پر بھی طیش آجاتا تھا چنانچہ خود کہتے ہیں ۵

مہر گمان توارد، یقین شناس کہ دزد متاع من زنہاں خانۂ ازل بردہ است

جناب آرگس نے غالب کے اس دعویٰ سخن آفرینی پر، نشتر طنز سے کام لیا ہے، لیکن حق تو یہ ہے کہ مرزا کو اپنی طباعی کا کافی احساس تھا۔ وہ متقدمین یا معاصرین سے توارد کے خیال پر بھی مچل جاتے تھے، اگر کلام غالب "حاصل دریوزہ گری" اور "مستعار" ہوتا، تو مرزا کے دماغ سے اس شورش وجدت پسندی کا اظہار نہ ہو سکتا۔ غالب کے تخیل کا علو، بیان کی لطافت طرز انشا کی بلاغت، اسلوب استدلال کی نفاست، اگر شعرائے متقدمین کے ہاں سے مستعار، اور حاصل دریوزہ گری ہوتی تو ایک لطیف ضمیر سے یہ ناممکن تھا کہ خود توارد وں سے سیراب ہوتا اور انہیں کو "نہاں خانہ ازل" کا چور رکھتا یہ زبردست اوعاصاف بتا رہا ہے کہ شاعر کو اپنی ذات، اور دماغ پر کس کمال درجہ کا اعتماد تھا، اس خود اعتمادی سے جو کچھ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ غالب کے خیالات ——— حاصل دریوزہ گری نہیں، اگر وہ مضامین دوسروں سے مستعار لیتے، تو، توارد متقدمین پر وہ فخر کرتے، اپنا یہ کمال دکھاتے کہ میرا تخیل متقدمین سے مل جاتا ہے، جذبۂ احترام کا اظہار رکھتے "نہاں خانہ ازل" کا چور بتانا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اُس نے مضامین کی بھیک نہیں لی، ایسی حالت میں، کہ وہ دوسروں سے مضامین مستعار لیتے، ان کے اندر اتنی جرأت کہاں کہ اس بے باکی سے متوارد کلام کو اپنا متاع ازلی سمجھتے اور پھر دوسرے شعرا کو "دزد" سے تعبیر کرتے، اس قسم کا تخیل پیش کرنا تو کجا ایسا ایک ہلکا سا خیال بھی انہیں "ایم، سی [۵۱] داؤگل" کے نظریہ نفسیاتی کے مطابق، روح فرسا کیفیات میں مبتلا رکھتا، نفسیاتی تحقیق بھی بتاتی ہے کہ غالب سارق مضامین نہ تھے۔ نہ انھوں نے متقدمین سے بھیک لیکر دعویٰ سخن آفرینی کیا، لیکن اوروں کے یہاں اسی قسم کا تخیل موجود ہونا مرزا کے قابو کی بات نہ تھی،

---

۵۱ انگلستان کا مشہور نفسی ایم سی داؤگل اپنی مقبول زبان کتاب .... "نفسیات اجتماع" (سوشل سائکالوجی) میں لکھتا ہے "افسوس ار Remorse سے تعبیر ہے، ایک مرکب جذبی کیفیت سے، جو ایک ترقی یافتہ جذبہ، متعلقہ ذات، خصوصاً جذبہ اخلاقی کا مظہر ہے، کسی فرد میں اس جذبہ کی اس وقت تکوین ہوتی ہے، جب اسے کسی ایسے فعل ماضی کی یاد آتی ہے، جسکے ارتکاب پہ وہ گہرے طور سے افسوس کرتا ہے، تمام جذبات افسوس کی طرح یہ بھی المناک ہے، چونکہ اس کا تہیج یا جذبۂ خواہش کا تعلق مستقبل کی بجائے ماضی سے ہوتا ہے، یہ جذبہ افسوس کی دوسری صورتوں سے مختلف ہے، چونکہ جو واقعہ اس جذبہ افسوس کا محرک ہے، اس کے حدوث کا موجب فرد متکیف کا خود اپنا عمل ہوتا ہے، (اسی معنی میں کسی نے کہا ہے، خود کردہ را علاجے نیست) اس لئے ناخوشگواری طبیعت کے باعث جس جذبہ غضب کی تکوین ہوتی ہے اس کا تعلق افراد کی ذات ہی سے ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں اظہار لعنت و ملامت سے قلب کو سکون نہیں ملا کرتا، (چونکہ یہ رشحہ تلویم و تلعین، بھی افراد متکیف کی ذات ہی سے وابستہ ہوتا ہے) بلکہ سکون کی بجائے الم انگیزی میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

کلام عرفی، اور حافظ و خسرو میں توارد

ایک کھٹکا یہ بھی گزرتا ہے کہ متوارد کلام کی کسی قدر تفصیلی روئداد آپنے ہدیہ ناظرین کی ہے خیال ہو سکتا ہے، توارد ہو گا بھی تو چند اشعار میں، یا اس قدر متعدد اشعار میں، میں کہتا ہوں کہ جن میں شعرا کے کلام کو غالب کے تخئیل کا ماخذ بتایا گیا ہے میں انہیں کے کلام سے اسی قدر اشعار پیش کر سکتا ہوں جو ان کے معاصرین اور متقدمین سے ملتے جلتے ہیں، عرفی کی معنی آفرینی اور گرمیِ سخن کا کسے اعتراف نہیں، لیکن جب ان کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کے بہت سے اشعار حافظ اور خسرو کے کلام سے مل جاتے ہیں، ذیل میں اس کی فہرست دی جاتی ہے،

عرفی اگر بہ سروی رہ دری منزل ہیں — رو کہ مددمی کند ہمت شاہ نجف

حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان عشق — بدرقۂ رہت شود ہمت شاہ نجف

مضمون بالکل ایک، الفاظ کی ترکیب بھی ملتی جلتی، حافظ کے ہاں بدرقہ رہت کا استعارہ البتہ زیادہ ہے۔

نظر بہ حال دل آں پر غرور نکشاید — کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغما را (عرفی)

غرور حسن اجازت مگر نداد اے گل — کہ پرسشے نکنی عندلیب شیدا را (حافظ)

دونوں کلام کی یکرنگی سے انکار نہیں ہو سکتا، حافظ کے یہاں عندلیب شیدا کی دلجوئی نہ کرنیکا استفہام ہے، عرفی نے علت و معلول دونوں بتا دئے، کہ بے التفاتی سیری پر مبنی ہے، البتہ "متاع یغما" کی جیسی بڑھی ہوئی ہے، جو حافظ کے یہاں نہیں،

از تیرہ کاری تو بہ خون می طپید دل — انگند غمزہ تو بہ بار گراں ہنوز (عرفی)

عالم تمام پر ز شہیدان فتنہ گشت — ترک مرا خدنگ بلا در کماں ہنوز (خسرو)

معنی کے اعتبار سے دونوں شعر یکساں ہیں، صرف دو تین الفاظ کا الٹ پھیر ہے خسرو کے ہاں "خدنگ بلا در کماں" ہے، عرفی نے اسے "غمزہ بہ بار گراں" میں پیش کیا ہے، مفہوم دونوں کا یکساں ہے۔

آبم آتش گشت و خاکم شد بہ خاکستر دل — اندریں رہ کس نمی داند سر انجام ہنوز (عرفی)

روز اول رفت دینم در سر زلفین تو — تا چہ خواہد شد دریں سودا سر انجام ہنوز (حافظ)

دونوں شعر کا دوسرا مصرعہ ہم معنی، الفاظ بھی ملتے جلتے، پہلا مصرعہ حالات کی ابتری کے اعتبار سے قریب قریب مماثل، البتہ عرفی کے ہاں پانی کا آگ ہونا اور مٹی کا گرد و غبار سے بدل جانا، کچھ زیادہ تاثر انگیز ہے۔

تو و بزم عیش عرفی من و کوچہ کہ ہر سو — سر خونچکاں فتادہ دل بے نوا نشستہ (عرفی)

در چار حد کوئے خود افتادہ بینی بندہ را — تن یکطرف جاں یکطرف سر یکطرف پا یکطرف (خسرو)

عرفی نے صرف اپنی کوچہ گردی اور کوئے معشوق کے خونی نظارہ کی تصویر کھینچی ہے، خسرو خود کوچۂ یار کا خونی منظر بن گئے ہیں خسرو نے اس خونی منظر کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھا ہے، عرفی نے عمومیت پیدا کر دی ہے۔ کوئے معشوق کا خونی نظارہ دونوں نے

عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہے، البتہ عرفی کا حسن ادا اور لطافت تخئیل قابل داد ہے، خسرو اظہار جذبات میں سبقت لے گئے ہیں حزیں صفہانی نے کوئے یار کو منظر خونی، تو نہ بتایا، البتہ اسمیں خانماں بربادوں کا ہجوم دکھا دیا، یہ خانماں بربادی صرف انسانوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ طیور پر بھی اس کا اثر پڑا ع

بہار عارضش ہر گوشہ را بے خانماں دارد　　زندد آتش زرویت عندلیباں آشیانہارا

داغ داغم کرد یاس و طالب کامم ہنوز　　دوزخ در ہر بن مو دارم و خامم ہنوز (عرفی)

ساقیا یک جرعہ زان آب آتشگوں کہ من　　درمیان پختگان عشق او خامم ہنوز (حافظ)

"طالب کام" ہونا اور پختگان عشق کے درمیان میں خامی کا احساس اور اس لئے آب آتشگوں کی طلبی، جذبۂ عشق کی ایک ہی شورش کا نتیجہ ہیں۔ عرفی کو بھی خامی کا احساس ہے اور حافظ کو بھی، ان کے یہاں بھی شوق طلب ہے، اور ان کے یہاں بھی قریب قریب یکساں ہیں اور معنی میں دونوں برابر،

ڈاکٹر نکلسن کی رائے

جناب آرگس مزید تو اور کی مثالیں چاہیں گے تو میں اور بھی عرفی کے کلام سے پیش کر سکتا ہوں عرفی پر کیا منحصر ہے جس شاعر کو جی چاہے لے لیجئے اس کے بہت سے اشعار متقدمین سے ملتے جلتے نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ارباب تمیز کا خیال ہے، خسرو، اور جامی نے نظامی کی شاعری کا گھر برباد کیا، اسی طرح انگلستان کا مشہور مستشرق، ڈاکٹر نکلسن جسکے ذوق فارسی، اور عربی کا طوفان مغرب سے گزر کر مشرق تک امنڈ آیا، اپنی مشہور تالیف منتخبات دیوان شمس تبریز" کے عالمانہ مقدمہ میں لکھتا ہے، کہ مولانا روم کی شاعری مختلف شعرائے متقدمین اور معاصرین سے متاثر ہوئی، ان میں فریدالدین عطار، حکیم سنائی، سعدی، نظامی اور عمر خیام کی تفصیل ہے، ڈاکٹر موصوف اس تاثر کی بنا تاریخی واقعات پر رکھتے ہیں چنانچہ فریدالدین عطار کے متعلق لکھتے ہیں کہ مولانا روم بلخ سے چلتے وقت نیشاپور سے گزرے، تو فریدالدین عطار نے انہیں اسرار نامہ دیا، حکیم سنائی کے متعلق ایک غزل میں خود مولانا فرماتے ہیں ع

گفت کسے خواجہ سنائی بمرد　　مرگ چنین خواجہ نہ کاریست خرد

دس مصرعہ کی غزل ہے جو سنائی کے خاص جذبۂ احترام و محبت کا پتہ بتاتی ہے، ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب بہ حوالہ مثنوی مترجمہ رڈ ہاؤس، افلاکی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں، کہ مولانا فرماتے تھے کلمۃ اللہ (قرآن مجید) بمنزلہ شیر ہے اور الہی نامہ (حدیقہ حکیم سنائی) اس کا جو ہر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے مولانا حکیم سنائی کے اشعار سے واقف تھے، سعدی سے مولانا کی ملاقات کے متعلق رڈ ہاؤس کا قول ترجمۂ مثنوی میں، اور رضا قلی خاں کا قول دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران کے مقدمہ میں موجود ہے مولانا اپنی غزل میں حضرت نظامی گنجوی کے متعلق کہتے ہیں۔

نظیر آن کہ نظامی بہ نظم می گوید　　جفا مکن کہ مرا طاقت جفائے تو نیست

اسی طرح مولانا کا یہ مصرعہ "چون فاختہ اویراں فریاد کنان کو، کو"

عمر خیام کی رباعی کی ایک بیت

دیدیم کہ بر کنگرہ اش فاختۂ   آواز ہمی داد کہ کو، کو، کو

سے ملجاتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں مولانا کی شاعری پر سعدی، نظامی اور خیام کا گہرا اثر نہ پڑا، البتہ سنائی اور عطار کے اثرات تمام دکمال آپ کی شاعری میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لئے دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمرج، کا انگریزی مقدمہ دیکھئے جو ڈاکٹر نکلسن کے ذوق استقرار کا نتیجہ ہے۔

الغرض دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی استفادۂ متقدمین سے گریز نہیں کر سکتا ہاں مستعار اور مستفاد میں فرق ہے، مستعار کی اصطلاح سرقہ کی بحث لاتی ہے، اور استفادہ قانون فطرت ہے مستعار کہنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے عمداً کسی کا مضمون الفاظ کے تغیر یا معنی کے الٹ پھیر کے ساتھ اپنا بنا لیا، مستفاد کہنے سے پتہ چلیگا کہ متقدمین کے تاثرات شاعر میں قدرتی طور پر ہیں تو ضرور، لیکن اس نے ان تاثرات کو اپنا ذاتی تاثر سمجھا، ان کے اظہار کے وقت اس کے ذہن میں یہ کھٹکا بھی نہ تھا کہ خارجی اثرات کو اس کے اظہار فکر و احساس میں میں کچھ بھی دخل ہے، اس کے افکار میں خارجی اثرات کی یہ آمیزش اس کے شعور و ادراک سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کی وضاحت اور تفصیل فلسفہ کی گہرائیوں میں لی جاتی ہے اور اس معنی میں ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب بجنوری مرحوم کا یہ نظریہ کہ غالب کا کلام اسی کا کلام ہے، مستعار نہیں، صحیح ہے۔

اب یہاں علم و عقل کی روشنی میں یہ پر لطف بحث پیدا ہوتی ہے، کہ آیا کوئی شاعر ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے، جسکا کلام سراپا اسی کا کلام ہو، متقدمین یا معاصرین سے متاثر اور مستفاد نہ ہو، ذیل میں اسی نظریہ پر بحث ہوگی۔

فلسفہ ڈاکٹر ابر کرامبی یورپ کا مشہور، طبیب اور فلسفی ڈاکٹر ابر کرامبی اپنی کتاب "قوائے عقلیہ" میں لکھتا ہے، قوت مصورہ کو عمل میں لانے کے لئے ہم لوگ حقیقی مناظر، حوادث، اور عادات کے جزوی عناصر کو لیتے ہیں، اور ان کو خود دماغ کے ایک نظام کے ذریعہ سے نئے طریقہ سے، ترکیب دیتے ہیں، اس ترکیب سے ایسے مرکبات تیار ہوجاتے ہیں، جن کا وجود فطرت میں نہیں ہوتا، ایک نقاش اس طریقہ سے ایک مقام کی تصویر تیار کرتا ہے اس میں وہ ان تمام خوبیوں، اور دلفریبیوں کو جمع کر دیتا ہے، جو بہت سے حقیقی مقامات میں پائی جاتی ہیں، اور ان کے نقائص سے قطع نظر کر لیتا ہے، ایک شاعر، یا ایک افسانہ نویس اسی طریقہ سے ایک فرضی شخص کی عادت کا ایک مرقع تیار کرتا ہے اور اس میں وہ تمام صفات خصوصی داخل کر دیتا ہے جو اسے اپنے مقصد کے مطابق اس فرضی شخص کی عادت کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ان مرکبات کی حیثیت محض فرضی اور خود درایانہ ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ انفرادی عناصر ایسے ہوں گے، جو حقیقتاً فطرت میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہ ایسا مرکب بالکل اس سے متغایر، اور مختلف نہ ہوگا جو واقعتاً فطرت میں پایا جاتا ہے، جب یہ اصول کسی تصویر یا افسانہ میں ملحوظ نہیں رہتا تو ہم لوگ ایسی چیز کو غیر فطری اور خرافات کہینگے

ڈاکٹر صاحب کے مفصلۂ بالا نظریہ سے ہملوگ اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں، کہ جب کوئی شے خواہ مادی ہو یا نفسی، غیر مرئی اور تخئیلی حیثیت رکھتی ہو، یا حسی اور بدیہی تو غیر معقولیت اور خرافات کے نقائص سے پاک ہوگی اور اس کے عناصر پہلے سے فطرت میں ضرور موجود ہوں گے؛ پس معلوم ہوا کہ انسانی تصورات اور تخئیلات کی رسائی فطرت سے بالاتر نہیں ہوسکتی پس انسان جو چیز پیش کریگا، تو ضروری ہے کہ اس چیز میں اس کے سابقہ معلومات، تجارب اور مشاہدات کو دخل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ انفرادی معلومات، تجربہ اور مشاہدہ کا کامل نہیں تو بڑا حصہ، اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات، سے بالواسطہ حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی انسان ایسا تخئیل نہیں پیش کر سکتا، جو سراپا اسی کے جودت ذہن اور رسائی فکر کا نتیجہ ہو، لیکن جسطرح سقراط کا عقلی علو، ارسطو کی منطق، بقراط کے طبی اکتشافات، ابن رشد کا فلسفہ، بطلیموس کی ہیئت ذاتی ابن ہیثم کا علم مناظر دنیا میں انفرادی اجتہادات کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، اور احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح غالب بھی اپنے رنگ سخن کے لحاظ سے عزت و احترام کا مستحق ہے، حالانکہ نہ سقراطیات و بقراطیات نئی چیزیں تھیں اور نہ غالبیات۔

کثرت مشاغل اور تنگی وقت کا گلہ کیا جائے، یا قلت معلومات اور ناموزونی طبیعت کا اعتراف، کہ اس وقت اس مسئلہ پر مبسوط بحث نہیں ہوسکتی ورنہ یہی ایک بحث فکر و احساس کی جولانی کے لئے کافی ہے، اور جس سے یہ ثابت ہوجائیگا کہ بہت سی باتیں متقدمین سے حاصل کرنے کے باوجود قابل ستائش ہوا کرتی ہیں، انسانی تخئیل اور افکار کا زیادہ حصہ تقلید اور تتبع پر منحصر ہے ہاں یہ تقلید اگر اچھوتی تقلید ہے اور یہ تتبع سراپا تتبع ہے تو معیوب ہے، اور اگر اس میں انفرادی کاوش ذہن اور فکری جولانیوں کا اضافہ ہے، تو مستحسن ہے، خدا کے فضل سے میرا تعلق غیر مقلد (اہلحدیث) فرقہ سے ہے، اور میں اسی معنی میں تقلید کا انکار کرتا ہوں ورنہ فطری تقلید کا کسے انکار ہے؟

اس وقت میں مختصراً اساطیر الاقدمین (میتھالوجی) اور ہیئت سے نظائر پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی طبائع کا رجحان کس طرح باوجود اختلافات زبان، ملکی حالات، قطع رسل و رسائل اور بلا مرابطہ و اختلاط، ذہنی اور فکری حیثیات سے مماثل پایا جاتا ہے، ہیئت سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اثر اً محض ایک دو مسائل کی تحقیق کا اضافہ کرنے پر، فخر ملک و قوم شمار کئے جاتے ہیں، اور ہیئت اجتماعی کی نظر میں معزز اور محترم ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہوجائیگی کہ ہوسکتا ہے یا نہیں غالب کا کلام "مستعار اور حاصل دریوزہ گری" صرف غالب ہی کے تخئیل کا نتیجہ ہو، ہاں اس تخئیل کے عناصر، قومی اور اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات سے بالواسطہ لئے گئے ہوں، اور بیچارے مرزا نے خاقانی اور جامی، سعدی اور حافظ، فیضی اور عرفی، خیام اور حزیں کے ان متوارد کلام کو آنکھوں سے تو دیکھا ہو، لیکن اس کا اثر مطلق ان کے دماغ میں موجود نہ ہو، پھر یہ بھی ماننا کہ غالب کے کلام میں گو دو ایک بھی طغرائے امتیاز آپ کو نظر آتے ہیں؟ —— تو علمائے ہیئت کی طرح غالب کو بھی قابل فخر و ستائش تسلیم کرنا پڑے گا

اساطیر الاقدمین | علمائے مغرب کی کاوشوں کی بدولت، اس موضوع پر جامع تصنیفات شائع ہوچکی ہیں، - اس سلسلہ میں

یونانیوں اور رومیوں کے فسانے، مصر اور ہند کے توہمات، چین اور جاپان کے اساطیر، بابل اور اسیریا کی قدیم عجائب پرستیاں، مکسیکو اور پیرو (امریکہ) کے اوہام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں، ڈونلڈ اے میکنزی، اپنی کتاب "بابل و اسیریا کے اوہام و فسانے" میں لکھتا ہے، جس طرح بھیم نے راکششوں کو مارا، اسی طرح ہرقل نے کیبڈن کا خاتمہ کیا اہل بابل کا یہ فسانہ جس میں گلگمیش کا سفر بادیہ پیمائی، اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں سے گزرنا، باغ درراغ سے گزر، بحر راج کے سواحل تک رسائی دکھائی جاتی ہے ہندوستان کے اس فسانہ سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے، جسمیں ہنومان کے واقعات بادیہ پیمائی، اور صحرا نوردی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جسوقت وہ سیتاجی کی تلاش میں سرگرداں تھے، اسی طرح اہل ہند کے فسانہ میں سسٹر نویڈیٹا نے سری کرشن جی کی نے نوازی اس کے دلکش اور غیر معمولی تاثرات، اور بستی کی نوجوان لڑکیوں پر جنھیں "گوپا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے ساحرانہ جذب کشش کا منظر دکھایا ہے، وہ یونانیوں کے اس ہیرو کی ترانہ سنجی اور نغمہ پردازی، اس کے غیر معمولی کرشمۂ ترنم اور مناظر فطرت پر اس کے حیرت انگیز اثرات سے ملتا جلتا ہے جو "گولڈن فلیس" کی تلاش میں، اور پھر دوبارہ اپنی بیوی کی اچانک وفات کے غیر معمولی رنج و الم میں عالم سفلی (انڈر ورلڈ) کے سفر میں جا رہا تھا۔

حلول ارواح کے متعلق، یونان، مصر، ہند اور سب سے بڑھکر قدیم اہل عرب کا ایک عقیدہ معلوم ہوتا ہے، یونان میں حضرت مسیح کے پانچسو برس قبل ایک فلسفی فیثاغورس تناسخ کا قائل تھا، اسی طرح ہند میں بھی آج تک یہ خیال موجود ہے، ڈونلڈ اے میکنزی اپنی دوسری تصنیف "قدیم اہل مصر کے فسانہ و اوہام" میں لکھتا ہے کہ جب مصر میں کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کا ایک مجسمہ اس کی قبر پر رکھدیا جاتا ان کا عقیدہ تھا کہ متوفی کی روح اس مجسمہ میں داخل ہوتی ہے، ورنہ حلول کے لئے ادہر ادہر بھٹکتی پھرتی ہے، اس لئے وہ اس مجسمہ کے نزدیک اکل و شرب کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے خیال میں تین روحیں ہوتی تھیں، اس مجسمہ میں جو روح حلول کرتی تھی اسے وہ "کا" کے نام سے موسوم کرتے تھے احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حلول روح کے متعلق، قدیم عرب بھی وہم میں مبتلا تھے چنانچہ امام بخاری مناقب میں عبدالرحمٰن ابن قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد قاسم بن محمد، جنازہ کو دیکھکر کھڑے نہیں ہوتے تھے، ——————

—————— انکا خیال تھا کہ متوفی کی روح، کسی پرند کے جسم میں حلول کرتی ہے، جب کوئی نیک عمل کرتا ہے، تو کبوتر وغیرہ کے جسم میں اس کی روح جاتی ہے، اور بد ہوتا ہے تو کوے وغیرہ میں۔ میکنزی نے اپنی اس تصنیف میں اہل مصر کی شجر پرستی کا بھی حال لکھا ہے، جو آج تک ہندوستان میں مروج ہے، اسی طرح مجھے یاد آتا ہے، کہ اہل مکسیکو، و پیرو (امریکہ) کے "واقعات و اوہام" میں یا "اہل جاپان کے توہمات" میں جو لیوس اسپنسر، اور ہوڈ لینڈ ڈیوس کی تصنیفات ہیں، ...... جن میں مصنف نے ان قدیم باشندوں کی تصویریں بنائی ہیں اور آفتاب کے سامنے تعبدانہ رنگ میں کھڑا دکھایا ہے، ہند میں آج تک آفتاب کی پرستش ہوتی ہے۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب تک قدیم اہل بابل، امریکہ، مصر، جاپان، ہند وغیرہ میں ذرائع آمد و رفت نہ تھے،

کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے اخلاق، طرز عبادت، اور عقاید کا علم ہوتا تو یہ مماثلت کیسی؟ گو قدیم ہندوستان کے اسباب رسل ورسائل وجہاز رانی کے متعلق بینی کمارسرکار نے اپنی علمی تصنیف "فنون حکمیہ میں اہل ہند کا کمال" میں لکھا ہی اسی طرح مصروہند کے ذرائع آمدورفت کے متعلق ہیروڈوٹس یونان کا قدیم مورخ اپنا خیال ظاہر کرتا ہی، لیکن یہ فسانے اور اوہام اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ کی روشنی وہاں تک نہیں پہونچ سکتی، آمدورفت کے ذرائع، اور رسل ورسائل کے اسباب بعد کی پیداوار ہیں۔ اس سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہی، کہ انسانی جذبات واحساسات یکساں ہیں ماحول کے مناظر نے اختلافات پیدا کئے، لیکن اصول میں نوع انسانی کی رفتار تخئیل ایک محور کے ماتحت ہی۔ بس ہو سکتا ہی کہ غالب کی شاعری اور شاعرانہ تاثرات، اہل فارس کی تقلید کا نتیجہ نہ ہوں، بلکہ نظری مناظر نے غالب پر اثر ڈالا ہو اور اہل فارس سے توارد، اور تمثیل کی وجہ وہی نوع انسانی کے مرکزی جذبات واحساسات کی مقارنت ہو۔؟

ہیئت موجودہ علم ہئیت پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ بتدریج اس میں انفرادی اضافے ہوتے گئے، اس فن کے سربرآوردہ علما ہیئت داں کے لقب سے مشہور ہوئے، گو انھوں نے متقدمین کی تقلید ہی کی ہو اور صرف ایک ہی مسئلہ میں اجتہادی نظر ڈالی ہو، چنانچہ بطلیموس، مصر کا مشہور ہیئت داں بروج کی تخصیص، اور ان کے تسمیہ میں اہل بابل کا مقلد ہی، بطلیموس پر کیا منحصر ہے، آج تک اقوام عالم میں بروج کے متعلق وہی افکار ہیں، جو قدیم اہل بابل کی رسائی ذہن کا نتیجہ ہیں، میکنزی نے اس نظریہ کو بھی شد ومد سے پیش کیا ہی، اسی طرح بطلیموس سے لیکر البطانی (جسے بطلیموس عرب کہا جاتا ہی) عباسیہ اور فاطمہ کے علمائے ہئیت بنو شاکر، ابوالحسن، اور ابن یونس کے زمانہ تک ایک نظریہ رہا، یہاں تک کہ یورپ میں کوپرنیکس پیدا ہوا، اور اس نے بطلیموس کے نظام میں یہ تغیر کیا کہ زمین بھی ایک کرہ ہی اور بجائے ارض کے آفتاب اس نظام کا مرکز ہے۔

البطانی جو عرب اسلام میں سب سے پہلے مشہور ہیئت داں گزرا ہی اس کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کے اس اجتہادی نظریہ پر ہی کہ اس نے ہیئت اور علم مثلث کے حساب میں وتر دائرہ کے بدلے جیب متساوی (   ) کا استعمال کیا، دسویں صدی عیسوی میں بنو الجورکی شہرت ہیئت دانی اس نظریہ پر ہی کہ انھوں نے حرکات قمری کا اندازہ لگایا، عہد مامون میں بنو شاکر نے پہلے پہل منطقۃ البروج کے انحراف کا انکشاف اور تغیرات فی ہیئت القمر کا معائنہ کیا۔

اب اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے مغرب کی کاوشوں کو دیکھئے، مسٹر جین نے کرۂ ارض کی ہیئت کے متعلق اپنی تحقیق پیش کی، لینگلے نے جبل دھبوں پر آفتاب کے متعلق اپنی فکری قوت کو جولانی دی، کلف آفتاب کے متعلق ______ پروفیسر سیمپسن کی تحقیق موجود ہی، مشتری پر کرۂ ہوا کے وجود کے متعلق تین علمائے رصدگاہ ایڈمیرل اسمتھ مسٹر میکر اور ڈاکٹر پیرسن نے نظریات کا اضافہ کیا، مولٹن نے "سائنس ان ماڈرن لائف" (جدید زندگی میں علم وحکمت) کی پہلی جلد میں اس طرح کی بیسیوں مثالیں پیش کی ہیں،

کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جب بطلیموس، البطانی، ابن یونس، مسٹر جین اور بیرسن، وغیرہ کی علم دانی، اور شہرت، متقدمین کی تقلید کے باوجود، چند تحقیقات انفرادی کے باعث احترام و عظمت کی مستحق ہیں، تو کیا غالب شعرائے متقدمین کے مقابلہ میں صرف " دریوزہ گر" اور "مستعیر" ہی کہلانے کا مستحق تھا، کسی مدح و ستائش کا نہیں ؟

لطیف اسلوب بیان اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال میں، آج اردو غالب کی بہت کچھ مرہون منت ہے اردو میں خواجہ حافظ کے طرز میں کسی نے کچھ کہا تو میرے خیال میں وہ مرزا غالب ہی ہیں، بے باکی، مذہب سے لاپروائی، رندمشی مشرب و دوام کیف و مستی اور اسپر صوفیانہ خیالات کی روانی، جذبۂ و احساس کا وفور، ذوق و نشاط کا سیلاب جو تغزل کی جان ہیں، جس طرح خواجہ حافظ کے ہاں پائے جاتے ہیں اسی طرح مرزا غالب کے یہاں ہیں،

عبد المالک آروی

صدائے شکست

(فسانہ)

ملہر راؤ جس وقت میوزک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے آئے تو سب نے ان کی صورت دیکھ کر حکم لگا دیا کہ یقیناً یہ شخص موسیقی کا بڑا ماہر ہوگا، کیونکہ قدرت اس قدر ظالم نہیں ہوسکتی کہ ایک انسان کو اس قدر بدصورت بنائے اور پھر اس کی تلافی کسی اور طرح نہ کرے۔
سیاہ فام چہرہ چیچک کے داغوں سے ناہموار، چوڑی ناک بانسے کے قریب بالکل چپٹی، آنکھیں غیر معمولی طور پر بھیانک ہونے کی حد تک بڑی، ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے لیکر ٹھوڑی تک ایک سطح نظر آتی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا جس سے دہن کا وجود متعین ہوسکتا قد چھوٹا، قامت ناموزوں، ہاتھ پاؤں بدنما، الغرض ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے وہ انتہائی بدقسمت انسان تھا اور بدصورتی کا ایک مجسمہ لیکن اسی کے ساتھ خدا نے موسیقی کی ایسی زبردست دولت اس کو عطا کر دی تھی کہ دنیا اس کی عزت کرنے پر مجبور تھی اور جس وقت وہ اپنے گلے سے کوئی آواز پیدا کرتا تو اس کی اسی مکروہ صورت پر اک خاص قسم کا روحانی حسن چھا جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ کوئی دیوتا ہے جو مصلحتاً ایسی صورت اختیار کرکے آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری دولت اس کی لڑکی رجنا تھی، جو کسی طرح بہ لحاظ صورت اپنے باپ کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن ذوق موسیقی کے لحاظ سے ماننا پڑتا تھا کہ سوائے ملہر راؤ کے وہ کسی اور درخت کا پھل ہو ہی نہیں سکتی۔

یوں تو وہ غیر معمولی کیا، معمولی حسین بھی نہ تھی، اور اس کا کوئی عضو علیحدہ علیحدہ کسی مخصوص جمال کا مالک نہ تھا، لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ بہت دلکش چیز تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص اس کو ایک بار دیکھنے کے بعد، دوبارہ نظر اٹھانے پر مجبور نہ ہو جائے اگر کسی عورت کے خد و خال میں نمایاں نقص نہ ہو، تو سانولا رنگ اور کتابی چہرہ، یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ شباب کے ساتھ ملکر کافی قیامت ہو جاتی ہیں، چہ جائیکہ قامت میں رعنائی ہو اور اداؤں میں تہذیب کی دلکشی کہ پھر تو مرد کا اس کے سامنے سراپا "عذر" ہو کر رہ جانا ناگزیر ہے۔

رجنا جس کی عمر ۲۱ سال کی ہوگی۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے یقیناً غیر معمولی چیز تھی اور چونکہ وہ مدراس یونیورسٹی کی گریجویٹ بھی تھی اس لئے اس کے دلکشی جمال ایک ایسی سنجیدہ فضا پیدا کر دیتی تھی کہ وہاں تک پہونچنے کی ہمت مشکل سے کسی کو ہوتی تھی جب وہ کالج میں اپنے باپ کے ساتھ آتی (اور ہفتہ میں دو چار بار ضرور آتی) اور کسی درجہ کی تعلیم کو آکر دیکھنے لگتی تو کبھی یہ ہوتا کہ استاد گھبرا کر خود خاموش ہو جاتا اور کبھی وہ خود اس کے ہاتھ سے ساز لیکر درس میں مشغول ہو جاتی۔ طلبہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے کہ کاش رجنا بائی ان کے درجہ میں آجائے نہ اس لئے کہ وہ عورت تھی اور جوان و دلکش عورت، بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا ہر درس

موسیقی اک مستقل "نشۂ حیات" ہوا کرتا تھا اور اس کی آواز کا ہر ہر جزو، ہر ہر نشیب و فراز، ایک ایسا نقشِ روح ہوتا تھا جو کبھی مٹ نہ سکتا تھا۔

یوں تو وہ ہر ساز کو تکمیل کے ساتھ بجا سکتی تھی کیونکہ اس کا باپ حقیقتاً بین کار ہی تھا اور اس نے رجنا کو بھی بین ہی میں ماہر کیا تھا جس کی مہارت تمام سازوں کا مالک بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی فطری ذوق کے لحاظ سے زیادہ تر سرود کی طرف مائل تھی اور حقیقت یہ ہے کہ جس وقت وہ بین کی نزاکتوں کو (جو حقیقتاً خود اسی کے ذوق کی نزاکتیں تھیں) سرود میں ظاہر کرتی تھی، تو نہ سرود سرود رہتا تھا اور نہ وہ مغنیہ۔ وہ ترقی کر کے کوئی ایسا ساز ہو جاتا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا اور یہ ایک مغنیہ کی حیثیت سے بڑھکر کوئی ایسی ہستی نظر آتی جو صرف اساطیر و صنمیات میں پائی جاتی ہے۔

رجنا اپنے اخلاق و اوقات کے لحاظ سے اس قدر صحیح نمونہ انسانیت و نسائیت کا تھی کہ اس کو دیکھکر قدیم آریہ ورت کی وہ دیویاں یاد آ جاتی تھیں، جن کا ذکر اب صرف کہانیوں میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ ماں عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ اس لئے اپنے باپ کی آسائش اور دو چھوٹے بھائیوں کی پرورش و تربیت بھی اسی کے ذمہ تھی اس کی شادی کمسنی میں ہوگئی تھی لیکن قبل بلوغ اس کا شوہر مر گیا اور وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے دوسری شادی کی مخالف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے ساری عمر باپ ہی کے گھر میں بھائیوں ہی کی خدمت میں صرف کرنا ہے اس لئے وہ اپنے موجودہ حال پر حد درجہ قانع تھی اور اس نے اپنے باپ کے گھر کو اپنے سلیقہ و تمیز، اپنی روحانی شگفتگی اور اپنی اخلاقی دلآویزی سے ایک مختصر سی جنت بنا رکھا تھا جس میں سوائے اس کے باپ کے کسی اور جنتی کی گنجائش نہ تھی جو اس حور کے شمائل سے متاثر ہوتا۔ اول تو یوں بھی ملہر راؤ کے گھر بہت کم آدمی آتے جاتے تھے کیونکہ وہ خود اپنے اندر سوسائٹی کی کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا اور جو لوگ آتے بھی تھے سو وہ اس تمنا کو لیکر کہ رجنا بائی سے ملاقات ہو جائے گی، لیکن اس کی اوقات کچھ ایسے مصروف تھے کہ مشکل ہی سے کبھی اس کو لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملتا

وہ بہت صبح اُٹھتی اور اسی وقت نہا کر، پوجا میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی پوجا یقیناً وہ پوجا نہیں تھی جس میں مورتیوں کو سامنے رکھ کر گھنٹیوں کی آواز سنائی جاتی ہے یا چھوٹے چھوٹے چمچوں سے ان پر پانی گرایا جاتا ہے۔ اشلوکوں کا ورد ہوتا ہے جنہیں پڑھنے والا خود نہیں سمجھتا بلکہ اس کی پوجا صرف خیال و مراقبہ کی تھی، محویت و استغراق کی تھی یعنی بجائے اس کے کہ وہ خود کسی بت کو پوجتی، خود بت ہو جاتی تھی اور پرستش کے لائق۔ کبھی کبھی وہ اس کے بعد گاتی بھی تھی اور یہ گانا اس کا اس درجہ بلند، اس قدر پردردہ روح اور ایسا الہامانہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس کی تکرار دوسرے وقت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت اس کا گانا اس کی وہ دلی التجائیں وہ روحانی تمنائیں ہوتی تھیں جو مقصود و مدعا سے بے نیاز کر کے تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتی ہیں۔ وہ نغمۂ صباحی کے بعد اس کی فارغِ گریہ آنکھوں میں ہلکا سا نم جس کے اندر سے آنکھ کی چمک ایک محدب شیشہ کا جلا دینے والا نقطۂ نور معلوم ہوتی تھی، وہ اس کے رخسار کی رنگین تازگی، وہ صبح صادق کی سی وسیع پیشانی، الغرض تمام وہ دلکشیاں جو کسی فرضِ خداوندی سے فارغ ہونے کے بعد ایک مطمئن قلب انسان کی ہستی میں پیدا کر دیتا ہے، کچھ ایسی تکمیل کے ساتھ اس کے چہرہ پر

نمودار ہوجاتی تھیں کہ بقول ہمارے ایک دوست کے (جنھوں نے ایک دو مرتبہ اس کو صبح کے وقت دیکھا تھا) بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے دوزانو ہوجاؤ۔

وہ صبح کی پوجا کے بعد طلوع آفتاب سے قبل تمام خانہ داری کی ضروریات سے فارغ ہوکر، اپنے بھائیوں کو لیکر بیٹھ جاتی اور اُن کو پڑھاتی، یہاں تک کہ اسکول کا وقت آجاتا اور وہ بچوں کو روانہ کرکے کبھی میوزک کالج چلی جاتی اور کبھی گھر ہی پر مطالعہ کتب میں مصروف ہوجاتی۔ وہ مذہباً کچھ بھی ہو لیکن اعتقاداً و عملاً بالکل تھیا سوفسٹ (صوفی) تھی اور خدا اور مذہب کا ایک خاص مفہوم اسکے ذہن میں تھا۔ وہ تفریق مذہبی اور جماعتی عصبیت سے بالکل ناواقف تھی اور وہ ہر انسان کو خواہ وہ کسی مشرب و ملت کا ہو، نگاہ لطف و اخوت سے دیکھتی تھی۔ الغرض یہ تھی بلند سیرت رجنا کی جس نے ایک عام صفتِ محبوبیت اس کے اندر پیدا کردی تھی،

(۲)

میوزک کالج کے طلبہ میں راج کمار بوس، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بنگال میں موسیقی معاشرت کا ایک ضروری جزو ہوکر رہگئی ہے اس لئے وہاں کا ہر فرد کچھ نہ کچھ ذوق اس کا رکھتا ہے، لیکن راج کمار کا خاندان چونکہ خصوصیت کے ساتھ فنون لطیفہ کا ماہر مانا جاتا تھا اس لئے اس کے اندر یہ ذوق زیادہ تکمیل کے ساتھ پایا جاتا اور وہ بنگال اور مدراس کی موسیقی کے فرق کو سمجھتا تھا، اسلئے جب اس نے یہ سنا کہ مدراس کا مشہور نایک ملہر راؤ میوزک کالج میں پرنسپل ہوکر آیا ہے تو اس نے بھی ایک اسکالر کی حیثیت سے اپنے آپ کو کالج سے وابستہ کردیا اور چند دن میں اس کی غیر معمولی ذہانت اور فطری ذوق نے ایک استادانہ حیثیت حاصل کرلی

رجنا بائی کے عام اخلاق اور مہارت فن نے جس طرح اور ہر شخص کی نگاہ میں اس کو عزیز و محبوب بنا رکھا تھا اسی طرح راج کمار پر بھی اس کا خاص اثر تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ دنیا جب رجنا کو محو ترنم دیکھتی تھی تو بیتاب ہوجاتی تھی اور داد دینے پر مجبور۔ لیکن یہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے نہایت خاموش لطف اٹھاتا اور جس وقت سارے مجمع کی نظریں حریص ہوکر رجنا پر پڑتیں، اس کی نگاہ صرف ایک پرستش خاموش ہوکر نکلتی اور اس کا پیام اعتراف صرف اُس کے چہرہ کا وہ رنگ ہوتا جس کے تغیر کا سمجھنے والا مجمع میں سوائے ایک ہستی کے اور کوئی نہ ہوتا۔

راج کمار قصداً اِن موقعوں کو بچا جاتا جب اسے رجنا سے مخاطب ہونا پڑتا اور رجنا بھی یہ سمجھکر کوشش کرتی کہ کوئی موقعہ ایسا ہاتھ نہ آئے اور اس میں بڑی حد تک اس کا جذبۂ نسائیت بھی شامل ہوتا۔ چھ مہینے گزر چکے ہیں اور کالج کی فضا کا کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا استاد ایسا نہیں ہے جس کو رجنا سے گفتگو کرنے بلکہ ایک حد تک بے تکلف ہوجانے کا موقعہ نہ ملا ہو۔ لیکن راج کمار کو ابھی تک یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، اور اگر کبھی وہ اس کا خیال بھی کرتا تو کانپ اُٹھتا کیونکہ اس حجاب و شرم کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی تھی وہ اسی قدر زیادہ شدت کیساتھ محسوس کرتا جاتا تھا کہ کہیں یہ سکوت کسی خاص ہنگامہ کی پرورش تو نہیں ہے۔ یہ اجتناب کسی مخصوص جذب و کشش کا مقابلہ تو نہیں ہے اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس قفل خموشی کا ٹوٹنا کسی طلسم کا ٹوٹ جانا ثابت ہو۔

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(دار العلوم ندوۃ العلماء)

مصدر لطف و کرم۔ ہدیۂ سپاس و نیاز

آپ نے ستم کیا کہ میری "غلط فہمی" کے خیال سے اپنی "چھیڑ" ملتوی رکھی، میں تو ان شامت زدوں میں ہوں، جو اس چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غلط فہمی کیسی؟ آپ کا یہ شکوہ کہ "میں نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقاتوں کا ذکر یوں آزادی و بیباکی سے کر دیا" سر آنکھوں پر گزارش یہ ہے کہ میرا یہ غضب تو محدود تھا جناب ہی کی بارگاہ قدس تک، لیکن غضب آپ نے کیا کہ رازِ درونِ پردہ طشت از بام کر دیا آپ کی دلچسپ تمہید میرے لئے بائیہ سرور نشاط و مسرت ثابت ہوئی، یہ تو تھی خارج از موضوع گفتگو چاہتا ہوں کہ اصل موضوع پر پھر جناب کی کچھ تضیع اوقات کروں،

کر بھلے تو مارا کرد گستاخ

شاید میں اپنا مافی الضمیر صحیح طور سے پیش نہ کر سکا، جن چیزوں کا آپ نے جواب مرحمت فرمایا ہے وہ محض ضمنی ہیں، یعنی اپنے عزم صمیم اور ظن قیم کا لوگوں کے بالکل علی الرغم اظہار و اعلان، بلاشبہ میرا یہ مطالبہ تھا اور مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنے خیالات و داعیات، منظر عام پر پیش کر دئے، لیکن اصلی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھنا" کہاں تک مستحسن ہے؟ آخر وقت و زمانہ کا اقتضا کیا ہوتا ہے، تہذیب و تمدن کا معیار کیا ہے؟ کیا ہر عالمگیر حکومت کا نظام تہذیب غلاموں کے لئے وحی آسمانی ہے، کیا ہر چمکتی چیز سونا ہے کیا ہر رنگ و بو والی چیز لطیف ہوتی ہے؟ کیا ہر نقش و نگار والی چیز مرکز جذب کشش ہو سکتی ہے اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہو تو گزارش ہے بصد عجز و نیاز، سوال ہے بصد احترام و آداب کہ کیا یورپ کی تہذیب تہذیب ہے کیا یورپ کا تمدن تمدن ہے؟ مانا کہ یورپ کے بتان سیمین بدن دنیا کو تسخیر کر چکے، تسلیم کہ مہوشان یورپ نے عالم نسائیات میں ایک موج تازہ پیدا کر دی، اقرار کہ دانایان فرنگ نے عالم ایجاد و اختراع میں، عالم علم و عمل میں، عالم تہذیب و تمدن میں، عالم انسانیت و شائستگی میں ایک حد یدراستہ پیدا کر لیا، لیکن غور طلب یہ ہے کہ کیا یورپ کی حضارت رحمۃ للعالمین ہے کیا یورپ کا تمدن باعث فوز و فلاح ہے کیا یورپ کی شائستگی لائق اعتماد ہے، کیا یورپ کی ذہنیت

لائق تقلید ہے؟ ہو سکتا ہے کہ جوانی کے نشہ میں، غفلت کی ترنگ میں، نادانی کے دہن میں، ہم اس کی کورانہ تقلید شروع کر دیں، ممکن ہے کہ اس کی ہر ادا ہمارے لئے جنت نگاہ اور فردوس گوش ہو، ناممکن نہیں کہ اس کے خیالات و داعیات ہمارے لئے باعث دلچسپی ہوں، لیکن کیا اس صورت میں حقیقتہً" وہ معلم اخلاق، مصلح تمدن، اور بانی بنائے انسانیت و شائستگی تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

آپ کا ارشاد ہے کہ "جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں، وہ ان کے انحطاط و زوال کا انتہائی دور ہے" میری گزارش ہے کہ یورپ اس وقت جس صراط مستقیم سے گزر رہا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم ہے، لیکن حکم میں "پل صراط" کے ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اس کے نیچے ایک غار ہے جو نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قوموں کو ہضم کر چکا ہے لیکن اب تک اس کی شکم سیری نہیں ہوئی، مدہوش یورپ مستقبل بدوش یورپ، مست و بیخبر یورپ اب سکر کے عالم میں ہے اس کے قدم میں تنزلزل، اس کی حرکت میں ارتعاش، اس کی اداؤں میں اضطراب پیدا ہو چکا ہے، وہ عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہے جس میں اس جیسی نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قومیں ایسی گریں کہ آج ان کے نام کے سوا کوئی یادگار باقی نہیں،

یورپ آج "برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہے، جانتا ہے کہ اس مصیبت عظمیٰ سے رہائی ناممکن ہے، سمجھتا ہے کہ اس لعنت سرمدی سے نجات ناممکن ہے، محسوس کرتا ہے کہ اس کی کشتی عمر بھنور میں ہے تو اب وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دے۔ یہ نہیں کرتا کہ استقلال و ثبات سے اپنی سیہ کارزندگی کو ختم کر دے، بلکہ کوشش کرتا ہے اس کی کہ یہ لعنت عام ہو جائے یہ گندے جراثیم تمام اقوام و ملل میں راسخ ہو جائیں، تاکہ حشر سب کا ایک ہو،

بلاشبہ یورپ نے عورتوں کو آزادی دی ہے لیکن آج وہ

سعدی از دست خویشتن فریاد

کا صحیح مصداق ہے، پچھتاتا ہے اپنی اس حماقت پر، کف افسوس ملتا ہے اپنی اس نادانی پر تاسف کرتا ہے اپنی اس جہالت پر، چارلی چیپلن کے ساتھ اس کی بی بی نے جو کچھ کیا وہ پبلک میں آ چکا ہے، اسی قسم کے، بلکہ اس سے بھی بڑھے ہوئے واقعات و حادثات ہر روز پیش آتے ہیں، اب وہ خود نادم ہے کہ اس نے اعتدال کو چھوڑ کر افراط کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ کتنا غلط تھا؟ کتنا گمراہ کن تھا؟ کتنا حماقت انگیز تھا۔ آزادی اسلام نے بھی دی، لیکن "باندازۂ ظرف" یورپ نے بھی آزادی دی لیکن "بقدر ذوق"۔ آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ اعتدال و افراط میں کیا فرق ہے، آپ نے دیکھ لیا

کہ حوا کی ان بیٹیوں کو آزادی دینے کے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں ؟ پھر جب قرآن کہتا ہے کہ "ان کیدکن عظیم" تو ماتھے پر شکن پڑجاتی ہے، ابروؤں پر بل آجاتا ہے، اسلام نے عورتوں کو مسیحیت کی طرح لعنت نہیں سمجھا ہے، اس نے مسجدوں میں جانے کی اجازت دی ہے، کام کاج کرنے کی اجازت دی ہے، میدان جہاد میں خواتین اسلام نے خدمات انجام دئے، معرکۂ کارزار میں عورتوں نے مرہم پٹی کے فرائض انجام دئے، تفقہہ فی الدین کیا، علوم وفنون پر عبور حاصل کیا لیکن کلب کی ممبری کبھی نہیں کی، مسجدوں میں جانے کے لئے اصرار کیا ملاحظہ ہو:

"حدثنی عن مالک عن یحیی بن سعید عن عاتکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل امرأۃ عمر بن الخطاب انها کانت تستاذن عمر بن الخطاب الی المسجد فیسکت فتقول واللہ لاخرجن الا ان تمنعنی فلا یمنعها مؤطا امام مالک صفحہ ۶۷ مطبوعہ مصر"

یعنی حضرت عمر بن الخطاب کی زوجۂ محترمہ مسجد جانیکی اجازت حضرت عمر رض سے طلب فرمایا کرتی تھیں آپ خاموش رہتے تھے، تو فرماتی تھیں خدا کی قسم جب تک آپ مجھے منع نہ کردیں گے میں برابر نکلونگی مگر آپ منع نہیں فرماتے تھے۔"

خواتین اسلام ہی عمر فاروق جیسے باجبروت وباہیبت خلیفہ کو برسر ممبر ٹوک دیتی تھیں، مگر پارک کی سیر، لوگوں سے اختلاط اور کلب کی ممبری، کبھی آپ کا شیوہ نہیں رہا، وہ انیس خلوت اور رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں لیکن مشیر کار کی حیثیت انکی کبھی نہیں رہی، اور غالباً جناب نے بھی اپنے اکثر افسانوں کا موضوع یہی رکھا۔ پھر اس انقلاب خیال اور تغیر عمل کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایکطرف تو عورتوں کے لئے افسانہ نگاری اور غزل گوئی کو آپ سرحد ممنوعہ کہتے ہیں دوسری طرف کھلے بندوں پھرنے کی اجازت بھی دیتے ہیں،

این چہ بوالعجبی است ؟!

کہا جاتاہے کہ یورپ رواداری کا علمبردار ہے، مساوات کا مبلغ ہے، اس لئے کہ اس کی حضارت معراج کمال پر پہونچ چکی ہے ایسی تنگ نظری اس سے نہیں سرزد ہوسکتی، قطع نظر کیجئے اس عہد جہالت سے جب یورپ پر کلیسا کا اقتدار تھا پوپ کی فرماں فرمائی تھی۔ اس عہد میمنت فرجام کو دیکھئے کہ باوجودیکہ یورپ، مذہب کو سیاست سے علٰحدہ کرچکا ہے کلیسا کو بے دخل کرچکا ہے لیکن اب بھی لنش کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ کالوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے کسی گورے کی توہین کی، ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، آگ میں جلایا جاتا ہے، یہ سب کچھ آئین نوازوں کا تہذیب

پرست محجع کرتا ہی، بغیر عدالت میں چارہ جوئی کے، پولیس نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہی اور خاموش رہتی ہی، سرخیل مہذبان یورپ امریکہ نے ابھی حال ہی میں ہندوستانیوں کو حقوق شہریت سے محروم کیا ہی جس پر ایک غیور و خوددار ہندوستانی نے خودکشی بھی کرلی، سارا منصفین زمانہ برطانیہ جو

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہی

کی صحیح مصداق ہی، چین کی طرف سے نظر توجہ ہٹاکر مصر کی طرف پھر توجہ مبذول فرمائی ہی اور دیکھتے ہی دیکھتے نحاس پاشا سے وزارت چھن گئی، محمود پاشا برسر اقتدار ہو گئے، پارلیمنٹ شکست ہوگئی، اور پھر سر آسٹن چیمبرلین کا ارشاد ہی کہ ہم مصر کے اندرونی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتے، پل کی پل میں بیک گردش چشم نیلوفری، عراق پر بھی ہماری سرکار دولت مدار کے ہوائی جہاز اڑنے لگے، ایران سے بھی معاہدہ ہوگیا، تہذیب و تمدن، انسانیت و شائستگی، حضارت و مدنیت، کا یہ کتنا شاندار اور دلفریب مرقع ہے ؟

کہا جاتا ہی کہ طفل یورپ پان اسلام ازم کے ہوے سے خائف نہیں ہی میں عرض کرتا ہوں کہ یہی تو وہ دھڑ کا ہے جس کے تخیل کے ایک طفل یورپ رعشہ براندام ہوجاتا ہی، گزشتہ جنگ عمومی میں یہ ہوا جناب لائڈ جارج صاحب جمیع القابہ کو نظر آیا تھا اور بڑی بیچارگی اور بیکسی کے لہجہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مسلمانوں کی ایک دیوار ہی، جو چین سے لیکر "تا بخاک کاشغر" ہندوستان سے لیکر مصر اور مصر سے لیکر تمام دنیا تک قایم ہی، اس آہنی دیوار سے جو اپنا سر ٹکرائے گا، خود اس کا سر پاش پاش ہوگا مگر اس دیوار میں تنزلزل بھی پیدا نہیں ہوسکتا، اور طفل یورپ کا یہی وہ دھڑکا تھا جس نے کابل کے بیدار بخت و جواں ہمت فرماں روا کو ہندوستان کی سیاحت نہیں کرنے دی اور ہاں یہی وہ ہوّا تھا جسنے ابن سعود کے ہاتھوں موتمر اسلامی کا خاتمہ کرایا، اور یہی وہ ہوّا تھا جس نے عبدالعزیز ثعلبی کو تیونس سے جلا وطن کرایا، جس نے برکت اللہ بھوپالی کا " دیار غیر میں" وطن سے دور" خاتمہ کرایا، انسانیت اور شائستگی کا یہ کتنا دلنشین نمونہ ہی؟

غرض یورپ کے کن کن کمالات و احسانات کا شکریہ ادا کیا جائے، اس نے عالم انسانیت پر جو عظیم احسانات کئے ہیں، دنیائے خدع و فریب میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، مشکل ہے کہ اس کوزہ میں اس دریا کی وسعت آسکے، مختصراً یوں سمجھئے کہ :- ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ، کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

ارشاد کیا گیا ہے کہ چونکہ تجربہ شاہد ہے کہ باندازۂ درازی داڑھی کی معصیت بر وری بڑھتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داڑھی رکھنا صورت ہی بگاڑتا ہے، اور نماز اس لئے اور یقیناً قابل مضحکہ ہے کہ اس سے ہئیت اجتماعی کے فوائد نہیں حاصل ہوتے، عرض ہے کہ "بزم میں اہل تماشا" کے ہونے سے "اہل نظر" کے فقدان کا تو حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی نماز تو اس سے صرف ہئیت اجتماعی کا پیدا کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ ذاتی نیائش و عبودیت کا اظہار بھی تھا، اور یہ مقصد بہرحال حاصل ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے ان ناچیز خیالات کو نگار میں جگہ دیکر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، بہتر ہوتا کہ آپ ان خیالات کو پیش نظر رکھکر آپ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے، تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں،

رئیس احمد جعفری

(نگار) - عزیزمن، آپ نے جس جوش و ولولہ کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی ہے اس کی داد تو یقیناً آپ کو ملنی چاہئے لیکن استدلال و استنتاج کے لحاظ سے (معاف فرمائیے) اگر یہ کہوں کہ آپ کی یہ تمام "کاوِ کاوِ خامہ فرسائی" شورش کتابت کی تسکین کے سوا اور کچھ نہیں ہے نہ اس لئے کہ قضایا کی ترتیب ناقص ہے، نہ اس لحاظ سے کہ نتیجہ آپ جو کچھ پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ دلائل کے منافی ہے، بلکہ صرف اس بناء پر کہ شاید جس طرح آپ اپنا مافی الضمیر اس سے قبل صحیح طور سے نہ پیش کر سکے تھے "اسی طرح میں بھی غالباً اپنا مدعا نہ سمجھا سکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو یورپ کی تہذیب و معاشرت پر گفتگو کرنی پڑی حالانکہ وہ بالکل خارج از بحث امر ہے۔

میرا یہ کہنا کہ "تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کا وقت کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" ہرگز اس نتیجہ کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم یورپ کی تہذیب و معاشرت کو کلیتہً قابل تقلید سمجھکر اس کی پیروی کرنے لگیں۔ میں نے آج تک کبھی اس کی تائید نہیں کی اور نہ میں افرنجیت و تفرنج کو مقتضائے فطرت انسانی سمجھتا ہوں۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اب سے ۱۳۰۰ سال قبل ملک عرب میں بیٹھکر جو قوانین ہماری معاشرت و تمدن کے لئے مرتب ہوئے تھے، وہ آج، ہندوستان، ترکی، ایران، افغانستان، افریقہ، مصر، چین، ہر جگہ عمومیت کے ساتھ قابل عمل نہیں ہو سکتے اور اس لئے اگر ماحول کے لحاظ سے ضروریات زمانہ کے اقتضاء سے، سیاسیات وقت کی بناء پر اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے، دیگر اقوام عالم کی ترقی علوم و فنون دوش بدوش دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے، ان قوانین کو بدلدینے کی ضرورت ہو، تو یقیناً انہیں بدل جانا چاہئے۔

اگر اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ وہ ناسخ ادیانِ سابقہ اور ماحیِ مذاہب قدیمہ ہے، یعنی اگر یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ انسان کو مہذب و شائستہ بنانے کے لئے، جامعۂ انسانیت کو "من حیث ہی الکل" تمام کون میں سربلند و ممتاز کرنے کے لئے اسلام آخری تعلیم اور بالکل آخری لفظ ہے، اگر "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" کوئی الہامی پیشین گوئی، کوئی خداوندی کلیہ ہے، اور اگر مسلمان انسان ہے اور انسانیت نام ہے صرف عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ بغیر دلیل کے تسلیم کیا جا سکتا ہے، اور اگر ہم آپ تسلیم بھی کر لیں تو کیا ہوتا ہے، دنیا تو اس کے لئے طیار نہیں ہو سکتی۔

پھر غور کیجئے کہ آپ کے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہو؟ سوائے اس کے کہ آپ اپنے ہاں کی تعلیم کو پیش کریں اور کیا کر سکتے ہیں، پھر اگر وہ تعلیم اس قدر ہمہ گیر، اتنی وسیع اور اس درجہ لچیلی ہو کہ ہر وقت و زمانہ ہر ملک و قوم کے حالات و طبائع اور امیال و عواطف کا ساتھ دے سکتی ہو تو بیشک آپ کا دعویٰ صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے ورنہ نہیں۔

کلام مجید میں سوائے بعض معاشری احکام کے (جن میں طلاق، نکاح، ترکہ وغیرہ شامل ہیں) اور جن کا اُس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے نص قطعی کی صورت میں پیش کرنا ضروری تھا اور جن میں اب ضرورت زمانہ کے لحاظ سے تغیر ضروری ہو، اور تمام تعلیمات ایسی ہیں جن میں ازل سے ابد تک کسی وقت کسی تغیر کی ضرورت نہیں، نہ اس لئے کہ انکا تعلق ایسے حقائق مسلّمہ اور بدیہیات واضحہ سے ہے کہ ان پر بحث کرنے کی کسی وقت حاجت ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ہماری حیات ارتقاء کا انحصار انہیں پر ہو مثلاً خدا کی وحدانیت انبیا کی رسالت کہ اُن کا تسلیم کرنا انسانی سراسیگی کے دور کرنے اور اجتماعی انضباط پیدا کرنے کے لئے ضروری ہو۔ یا درس اخلاق کہ اس کی اہمیت بھی کسی وقت کم نہیں ہو سکتی اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہاں تک کہ آج یورپ بھی جو عملاً بہت سی بد اخلاقیوں کا مرتکب ہوتا ہو مقالاً اسی کا دعوائے حمایت کرتا ہو۔ یقیناً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ اخلاق کی تعلیم اور اخوت کا درس تو ہر مذہب نے دیا ہو پھر اسلام میں وہ کیا خصوصیت ہو جس کی بنا پر اس کو خاتمۃ الکلام اور مقطع المذاہب کہہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب فرنگی محل اور دیوبند یا اپنے دار العلوم ندوہ کی فضا میں نہ ڈھونڈھیے، بلکہ اس کے لئے خود تھوڑی سی توسیع نظر اور اجتہاد فکر سے کام لیجئے جو ہر شخص کا فطری حق ہو اور اس وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ کلام مجید کیوں دوسرے صحف آسمانی اور کتب الہائی سے ممتاز ہو۔

یہ امر مسلّمۂ عالم ہو کہ صحیح معنے میں رشد و ہدایت کی زبان و تخیئل وہی ہو سکتی ہو جو جماعت مخاطب کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ اگر عام لوگوں کے سامنے بجائے اصول و ضرورت مذہب کے فلسفۂ مذہب کی تاریخ پر گفتگو کیجائے تو وہ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہو اور اس لئے اِن پر کوئی اثر بھی نہ ہوگا۔ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر تمام صحف آسمانی یا کتب ملہمہ کا نزول ہوا۔ پھر چونکہ موسیٰ، عیسیٰ، بودھ، کرشن وغیرہ تمام انبیا رسابقہ کے زمانہ میں دماغ انسانی نے اس قدر ترقی نہ کی تھی کہ وہ اعمال نیک و بد، جزا و سزا کے معمولی اور سطحی مفہوم کے سوا حقیقی معنی کو سمجھ سکیں اس لئے ان کے سادہ دماغوں کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش نہیں کیا گیا اور مابعد الطبیعیات کی دنیا قائم کر کے بہشت و دوزخ، عذاب و ثواب اُخروی کی زبان میں لوگوں کو عمل نیک کی دعوت دی گئی اور یقیناً وہ اثر ہوا جو مقصود تھا۔

جب نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا تو اس وقت بھی دنیا کوئی خاص ترقی نہ کر چکی تھی، لیکن خدا کے علم میں تھا کہ وہ دور نہضت و ارتقاء جو منتہائے نظر فطرت ہو سکتا ہو، اسی دور ظلمت و تاریکی کے بعد آنے والا ہو، اس لئے قرآن کو اُس تعلیم کا حامل بنا کر نازل کیا جس کے بعد پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت نہ ہو، یعنی اگر اس میں ایک طرف بلید دماغ والوں کے لئے وہی تعلیم کی "سادگی" ملحوظ رکھی گئی جو امم سابقہ کے لئے ان کے انبیا نے اختیار کی تھی تو دوسری طرف وہ "پُر کاری" بھی پیدا کی گئی جس کے سمجھنے کے بعد تمام اور تعلیمات

حرف غلط ہوکر رہجاتی ہیں۔

دیگر ادیان کی تعلیم کا ناقص پہلو باعتبار دنیاوی ترقی کے، جزا و سزا اور حیات بعد الموت کی تعلیم میں پنہاں تھا، لیکن قرآن ہی اول وہ صحیفۂ آسمانی ہے جس نے اس خیال اور تعلیم کی حقیقت کو ظاہر کیا اور بتایا کہ جو کچھ انسان کو اس باب میں اسوقت تک بتایا گیا وہ صرف ایک تعبیر مصلحت تھی، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب سب اسی دنیا سے متعلق ہے، یہاں تک کہ احیاء موتےٰ سے بھی مراد صرف مردہ اور جامد قوموں کا زندہ ہوجانا ہے۔

کلام مجید میں کوئی ایک تعلیمی آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں درس عمل نہ دیا گیا ہو اور محض زبانی حمد و ثنا یا مقامی تسبیح و تہلیل کی طرف ترغیب دلائی گئی ہو۔ اسلام نے ظاہری مراسم یا سطحی باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اُس نے صرف "بما کسبت قلوبکم" کو دیکھا اور اسی پر آخری حکم لگایا۔ جہاں سیئات کا ذکر کیا، اُس سے غیر عملی اور غیر مجاہدانہ زندگی مراد لی اور جہاں حسنات کا ذکر کیا اس سے عمل اور اجتہاد مراد لیا۔ اس نے بتایا کہ جنات عدن سے مقصود سوائے قومی ترقی کے اور کچھ نہیں ہے اور جہنم کا مفہوم اجتماعی انحطاط و زوال ہے۔ حور و قصور کوثر و سلسبیل کے معنے نبی آخر الزماں کے ظہور سے قبل خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن محمدؐ کے ذریعہ سے خدا نے ان الفاظ کا مفہوم صرف دنیاوی فلاح و ترقی قرار دیا، کیونکہ اگر مرنے کے بعد کسی عالم کو تسلیم کرلیا جائے تو وہاں کی خوشحالی یہاں کی تکالیف کا کیا بدل ہوسکتی ہے جبکہ اس کے بعد پھر کوئی حیات عمل انسان کو دی جانے والی نہیں ہے۔

الغرض میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہ تعلیم ——— صرف قرآن پاک نے دی اور یہی وہ امر مابہ الامتیاز ہے جو صحیفۂ محمدی کو صحف موسوی و عیسوی وغیرہ سے جدا کرتا ہے۔

پھر جس مذہب میں ترقی کی تعلیم اس قدر زبردست ہو اس کا اس قدر قدامت پسند ہونا کہ سیکڑوں سال قبل جو ایک طریقہ مقرر کردیا گیا ہو اس میں کسی تغیر کو قبول نہ کرے کس حد تک قرین عقل و انصاف سمجھا جاسکتا ہے۔ آپ خود اپنے ہاں کے قیاس، اجتہاد اور اجماع کو دیکھئے کہ یہ کیا ہیں۔ کیا یہ تغیر و تبدل کے مقتضی نہیں ہیں کیا ان کا وجود اس لئے نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ سے ہم وقت ضرورت کے مطابق قانون معیشت و معاشرت بنا سکیں۔

پھر جب یہ امر نہ صرف قرآن و حدیث بلکہ اکابر امت کے اقوال و عمل سے بھی ثابت ہے تو آج میرا یہ کہنا کہ "ہمارے تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں" کیوں چین پیشانی کا باعث ہوتا ہے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس تغیر سے مراد یہی ہے کہ بالکل یورپ کی زندگی کو اختیار کرلیا جائے۔ یہ تو میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر اہل یورپ میں کچھ باتیں قابل تقلید ہیں تو اُن کو کیوں نہ اختیار کیا جائے ———

——— جب کہ ارشاد نبوی "الحکمۃ ضالۃ المومن"۔ موجود ہے

آپ نے اہل یورپ کی موجودہ معاشرت کے جو جو نقائص ظاہر کئے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن اگر آپ اسی سلسلہ میں

"ہنرش نیز بگو" پر بھی عمل کرتے تو بہتر تھا۔ اگر اہل یورپ میں سو معایب ہیں تو دو چار خوبیاں بھی ہونگی، لیکن ہمارے معائب و محاسن میں تو یہ نسبت بھی نہیں ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے عادات و خصائل پر نکتہ چینی کا کیا حق حاصل ہے اور اس کو سوائے اس کے کہ Poor man's Consolation سے تعبیر کیا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں، اگر دانایان فرنگ کی ایجاد و اختراع، علم و عمل آپ کے نزدیک لغو و بیکار ہے، اگر ان کی دنیاوی ترقی آپ کے نقطۂ نظر سے زوال و انحطاط ہے، اگر اُنکی ذہنیت آپ کے لئے لائق تقلید نہیں ہے تو خدا کے لئے بتائے آپ کس راہ پر نوع انسان کو لیجانا چاہتے ہیں اور وہ "صراط مستقیم" آپ کی کونسی ہے جس کے نیچے "کوئی غار" نہیں پایا جاتا۔

اگر آج یورپ "برتھ کنٹرول" کی لعنت میں مبتلا ہے تو کیا ایشیا میں افزائش نسل کے ساتھ فاقہ کشی کو برکت خداوندی کہیں گے۔ اگر علوم و فنون کی ترقی آپ کے نزدیک خدا سے انحراف ہے تو خدا کے لئے بتائیے کہ جہل و جمود کیونکر خدا تک پہونچاتا ہے اگر یورپ کا انسان اپنے اعضاء سے کام لیکر رات دن محنت کرتا ہے تو آپ کے ہاں کا وہ زاہد شب زندہ دار جو توکل پر پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہے کیوں اس پر ہنسے، جبکہ وہ بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خدا نے ہاتھ کی پانچ انگلیاں اسی لئے بنائی ہیں کہ انسان پہاڑ ڈھائے اور زمین کھودے ورنہ محض تسبیح ہلانے کے لئے صرف ایک انگوٹھا اور کلمہ کی انگلی کافی تھی۔

آپ نے مغربی عورت کی آزادی کا جو مذموم پہلو پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے، لیکن بندہ نواز یہاں کی "پردہ نشینان حریم ناز" کی تردامنی بھی تو اس حد سے گزر گئی ہے کہ اس کو نچوڑ کر فرشتوں کو وضو کی دعوت دیجائے۔

اگر وہاں کا مرد عورت کی آزادی سے پریشان ہے۔ تو یہاں کی عورت مرد کے ظلم و استبداد سے چیخ اٹھی ہے، اگر وہاں اخلاقی انحطاط زیادہ ہے تو نشۂ دولت کی وجہ سے، لیکن افسوس تو ہم پر ہے کہ دولت بھی نہیں اور حسن اخلاق بھی ندارد۔ وہ گر معصیت کرتے ہیں تو "عذر ما بپذیر" کے ماتحت، اور آپ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس حال میں کہ کوئی حیلۂ غیر شرعی بھی موجود نہیں۔ وہ تو علانیہ کہتے ہیں کہ عصمت انسان کی کوئی بڑی ممدوح و مہتم بالشان صفت نہیں ہے کیونکہ اگر آج دنیا معصوم ہو جائے تو کائنات میں خاک اڑنے لگے۔ لیکن آپ تو اس کو غایت انسانیت سمجھتے ہیں اور پھر ترک کئے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح میں یورپ کے ظلم و استبداد، غیر رواداری، عدم مساوات وغیرہ وغیرہ تمام سیاسی و اخلاقی معایب کا معترف ہوں، لیکن میں کبھی انکا ذکر مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یورپ کے بدترین اخلاق کے مقابلہ میں جب ہم ایک بھی کوئی اس کا ضد پیش نہیں کر سکتے، تو ہم کو اس پند و موعظت کا کیا حق حاصل ہے۔ آپ کا یہ طعن مغرب کے خلاف صرف بیدست و پا، جاہل و ناقابل، کاہل و مجہول غلام کا سا غصہ ہے جو اپنے ہاتھ پانوں کی بیڑیاں کاٹنے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے صرف ظالم آقا کو گالیاں دینا ہی ذریعۂ نجات سمجھتا ہے

ہاں اسلامزم کے متعلق آپ نے لائڈ جارج کا جو فقرہ نقل کیا ہے اس سے آپ کا یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ واقعی اس مفروضہ خطرہ سے خائف ہے (معاف فرمائیے) انگریزی ذہنیت اور ڈپلومیسی سے آپ کے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ پہاڑ کو رائی بنا دینے کے لئے وہ کیونکر پہلے رائی کو پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ ورنہ لائڈ جارج اس قدر احمق نہیں

ہوسکتا کہ اپنی قوت کے مقابلہ میں ہمارے ضعف کو محسوس نہ کرسکے۔ پان اسلازم "بالقوۃ" یقیناً نہایت خطرناک چیز ہو اور اسی لحاظ سے لائڈ جارج نے یورپ کو اس سے متنبہ کیا لیکن جہاں تک "بالارادہ" کا واسطہ ہے، وہ اور سارا یورپ اب اسی طرح مطمئن ہے جس طرح ہم آپ مایوس۔ ہماری عملی قوت کا امتحان کافی ہوچکا ہے، اب خواہ مخواہ کے "تیوروں" سے کچھ نہیں ہوتا، بندر نچانے والا جانتا ہے کہ جب تک ہاتھ میں ڈنڈا موجود ہے بندر کو ناچنے سے مفر نہیں، اور اس لئے وہ بندر کی "بھبکیوں" کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور جب چاہتا ہے گردن کی رسی کو جنبش دیکر اپنی قوت کو تسلیم کرا لیتا ہے۔

نیاز

الاحتجاج والاعتذار

مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے اگست کے نگار میں مجھ پر تین ظلم کئے ہیں۔ دو کی شکایت تو میں ان سے پرائیویٹ طور پر کرچکا ہوں ایک تو میرے مضمون مذہب اور الٰہیات سے متعلق ہو جس کا زیادہ حصہ سہواً یا ارادتاً حذف ہونے کے بعد تمام سلسلہ مضمون خبط و بے ربط ہوگیا ہے اور دوسرے یہ کہ مضمون مذہب اور نبوت میں کتابت کی نہایت فاحش غلطیاں رہگئی ہیں جو کاتب نبوت کو ثبوت، اور قباحت کو قیامت یا معز کو فخر لکھے۔ میں اس کاتب کی جان کو روؤں یا سنگی طباعت کو یا اردو کے طرز تحریر کو بہرصورت مولانا نیاز اگر ایک نظر کاپی کو دیکھ لینے تو یقیناً بہت کچھ اصلاح کتابی غلطیوں کی ہوجاتی۔ خیر۔ تیسری بڑی شکایت مجھے ان کے "محاکمہ" سے ہے۔ اور اس کے متعلق میں پبلک طور سے پراٹسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالہ کی آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دیدیں۔ اگر احتجاج کا مفہوم پراٹسٹ سے ادا ہوسکتا ہو (جو خود اہل زبان نہیں سمجھتے ہیں) تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں حجت سے زیادہ اپنی معذوری یوں بزنگاہ رکھکر شکایت کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولانا نیاز نے اپنے محاکمہ میں بہت عجلت اور بے تابی سے کام لیا۔ اگر وہ تھوڑا اور انتظار کرتے تو آئندہ چلکر "مذہب اور عبادات" کے عنوان سے جو مضمون ہوتا اس سے ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجاتیں یا اگر وہ مذہب اور قومیت کے مضمون کو ذرا اور غور سے پڑھتے تو ان کا وہ اعتراض جو انہوں نے کیا ہے خود بخود اٹھ جاتا۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل ہوں کہ مذہب کا ایک مقصود ہئیت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے۔ اور مجھے خیال نہیں پڑتا کہ میں نے اس مضمون میں عبادات و معاملات میں کوئی تاویل کی ہو۔ میرے مضمون کے تنقیح طلب دو مسئلے تھے۔ آیا اسلام قومی مذہب ہو یا عمومی۔ دوسرے یہ کہ قرآن اسلام کے لئے کافی ہو یا نہیں، اگر وہ ان دو تنقیح طلب مسئلوں پر محاکمہ کرتے تو میں اس کو سر آنکھوں پر رکھتا مگر اصل تنقیح طلب مسائل کو چھوڑ کر صرف سلسلۂ گفتگو میں نماز و ارکان پر جو میں نے کچھ کلام کیا اس کی انہوں نے گرفت کرلی۔ اور اسپر دو تین ورق سیاہ کرڈالے شاید وہ ان حضرات کے خاطر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہوں جنہوں نے مجھ پر سب و شتم کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہوگی بلکہ خود مولانا

نیاز کے بائیکاٹ کا نوٹس دیا ہو۔ مگر میں مولانا کو کم سے کم اپنی ذات سے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ للہیت کی بنا پر اگر سب وشتم کیا بھی جائے تو میں اس کے سننے کے لئے بھی تیار ہوں اور جو حضرات اس کے لیے بیتاب ہوں ان کے لئے مضمون کے آخر میں میں نے اپنا پورا پتہ دیدیا ہو کہ وہ خود براہ راست مجھکو گالیاں دے لیں اور مولانا نیاز کو مجھ تک پہونچانے کی تکلیف نہ دیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو حضرات اس بات کے خوگر ہیں وہ اس کے جواز کے لئے حضرت عباس عم رسول اللہ کا جناب علی کرم اللہ وجہ کو خاطی الغادر الخائن کہنا یا عبد اللہ ابن زبیر اور ابن عباس کی مسئلہ متعہ پر تہتک جس کا ذکر صحاح ستہ میں بھی ہے شاہد پیش کرینگے اور جوش مذہبی اور للہیت میں تو جناب موسیٰ نے حضرت ہارون کی داڑھی کھینچ لی تھی اور توریت کی الواح کو اٹھاکر پھینک دیا تھا

مولانا نیاز نے مجھے خوانخواہ فقہی مسائل میں گھسیٹ لیا۔ حالانکہ نہ میں اس کا اہل تھا اور نہ میں قرآن سے باہر ضحاک و کعب احبار کی پرواہ کرتا ہوں۔ مگر اس معاملے میں مجھے اعتراف ہو کہ مجھ سے ایک ابتدائی غلطی ضرور ہوئی اور یہ کہ مذہب اور قومیت کا مضمون وہیں ختم کر دینا چاہیئے تھا جہاں تک جون کے پرچے میں چھپ چکا تھا۔ اور بقیہ حصہ جو جولائی کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔ وہ درحقیقت مضمون کے سلسلہ میں نہ تھا۔ بلکہ آخر میں ایک نوٹ تھا جو باریک حرفوں میں نیچے لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اور چونکہ وہ نوٹ نہایت سرسری طور سے لکھا گیا تھا۔ میں نے مسائل حدیث اور فقہ کو قرآن سے زائد دکھلانے کے قصد سے۔ ریمارک میں اتنا بڑھا دیا تھا کہ چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لہذا لغو ہے۔ یہ ایک ایسی چنگاری تھی جس نے مسلمانوں کے دل وجگر میں ایک آگ لگادی میرا خیال تھا کہ جب میں دوسری کتاب تنزیل القرآن لکھونگا تو اس میں ہر ایک مسئلہ اعتقادی اور اعمالی پر جو قرآن سے باہر حدیث میں ہے اس کی لغویت کئی حیثیت سے ثابت کرتا اور دکھلاتا کہ ایسی تمام حدیثیں موضوعات اور اسرائیلیات ہیں۔ مگر میں نے جوش میں اس نوٹ کو لکھہ ڈالا اور اس کو میں اب واپس لینے کیلئے تیار ہوں، اس لئے کہ میں ابھی اس مسئلے کی پوری منصفی کے قابل نہیں ہوا۔ ہاں میرا بے شک اب بھی یہی قول ہے کہ نماز اگر دنیاوی مشاغل کی انہماک میں ادا کی جائے تو اس سے بہتر ہے کہ نماز کو ترک کر دیا جائے، کیونکہ جو نماز یکسوئی اور حضور قلب سے نہ پڑھی جائے وہ نماز ایک قسم کا تمسخر ہے۔ محض منہ سے چند الفاظ کو بڑبڑا لینا اور چند بار اٹھک بیٹھک کر لینا نماز کا مقصد نہیں۔ لیکن اس قسم کی نماز ہمیشہ اسی وقت عادتاً کی جائیگی جو اوقات قرآن سے باہر ہے یکسوئی اور حضور قلب کا سب سے بہتر وقت وہ ہو جب کہ آدمی صبح اٹھتا ہو اور جب رات کو وہ آرام کرنے جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر اپنے گھر آتا ہو۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن اناء اللیل اس وقت اگر کوئی خدا کی طرف منہ نہ کرے تو نہایت بدبخت ہو۔ ہاں یوم جمعہ کو اگر مسلمان اسلامی سلطنت میں ہو جہاں اس کو اس روز چھٹی مل جاتی ہے تو اس روز جمعہ کی نماز دوپہر کو باجماعت پڑھنا فرض ہو۔ یہ ہو قرآن کا حکم۔ میں یہی کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں سوائے ان تین موزوں اور فطری اوقات کے اور کسی وقت کی نماز ثابت نہیں۔

حتیٰ کہ صاحب ہدایہ کو جب پانچ وقت کی نماز ثابت کرنی پڑی تو انہوں نے مجبور ہو کر "فسبحن اللہ حین تمسون وحین تظھرون" کی تاویل کی مگر شاید صاحب ہدایہ اپنے دل میں کبھی خود اپنی تاویل سے مطمئن نہ ہوئے ہوں گے، مولانا عبدالقادر اور ان کی تقلید میں مولوی نذیر احمد دہلوی نے "اطراف النہار" سے دوپہر کے معنے لئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اطراف النہار کے معنے دن کے لگ بھگ کئے ہیں۔ لیکن اگر وہ کشاف اور بیضاوی کی تفسیر دیکھیں تو اطراف النہار کے معنے محض صبح اور شام کے وقت کے ہیں اور یہی اصطلاح عرب کی ہے۔ عرب کو میں نے کبھی اطراف النہار سے ظہر مراد لیتے ہوئے نہیں سنا۔ "دلوک الشمس الی غسق اللیل" محض قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا کی تفسیر ہے اور جنہوں نے اس سے پانچ وقت کی نماز کی تاویل کی ہے۔ وہ مولانا محمد علی احمدی صاحب ہیں ظاہر ہے کہ ان کے وہم کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ پھر اگر آپ قرآن کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اس آیت سے پتہ چل جائیگا کہ ظہر کی نماز کو فرض کرنے کا خیال بھی قرآن حکیم کو نہ تھا یعنی جس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دوسروں کے خلوت میں جانے سے پہلے فلاں اوقات میں اذن لے لیا کرو۔ ایک وقت کا ذکر اس میں اس طرح ہے کہ بعد صلوٰۃ العشا مگر دوسرے وقت میں محض ظہیرہ یعنی دوپہر کے وقت۔ اگر ظہر کی نماز قرآن سے ثابت ہوتی تو جس طرح صلوٰۃ العشا کہا گیا ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ الظہر کہہ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھی جاتی۔ کیوں؟

اب آپ روایات پر آئے۔ اسد الغابہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں۔ مگر میں اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے کہتا ہوں کہ اسد الغابہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت دو نمازیں صبح ورات کی ادا کرتے تھے اور یہی فرض ہیں، بعد ہجرت نماز وسطے یا نماز عصر فرض ہوئی۔ خود وسطے کے معنی یہی بتا رہے ہیں کہ وہ تین کے بیچ میں ہے اور تین کے بیچ کو ہی وسطے کہتے ہیں یعنی اول اور آخر دو وسطے۔ مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے ظہر و عصر اور مغرب اور عشا کو بلا عذر وبلا خوف وبلا سفر جمع کیا ہے۔ نسائی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد تعجب سے کہتا ہے کہ یہ بھی ایک سنت ہے جو ہمارے زمانے میں لوگوں نے ترک کر دی ہے اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے بلا عذر کیوں جمع کیں میرے نزدیک تو اس کی سیدھی سادھی تاویل یہ ہے کہ آپ نے تین وقت کی نمازیں ادا کیں اور آپ نے وقفہ دیکر نمازیں پڑھیں راوی نے اس کو دو وقت کی نماز سمجھ لی۔ اب اگر آپ حدیث پڑھیں تو عصر و ظہر کے اوقات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ذرا غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عصر و ظہر کو ایک ہی وقت سمجھا جاتا تھا۔ یہ حدیث کہ آنحضرت پر شب معراج میں پچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس حدیث کو میں قطعی موضوع سمجھتا ہوں اور اگر موضوع نہیں ہے تو مرفوع ضرور ہے۔ اس واسطے کہ اس کے راوی انس ہیں اور انس کی عمر آنحضرت کے وفات کے وقت انیس برس کی تھی۔ اور آنحضرت کو معراج اس وقت ہوئی ہے۔ جبکہ انس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ اور ابوہریرہ اور ابن عباس کا تو اس وقت پتہ بھی نہ تھا۔ یہ روایت اگر ابوبکر صدیق یا حضرت علی کی ہوتی۔ تو اور بات تھی علاوہ اس کے اگر معراج

کا یہ واقعہ صحیح ہوتا تو قرآن کے سورۂ معراج یا بنی اسرائیل میں اس کا ذکر ضرور ہوتا مگر وہاں ہم کیا پاتے ہیں؟ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن الفجر" میں کہتا ہوں کہ معراج آسمانی خود ایک معارضہ ہے ورنہ نماز کی تعیین اس بھونڈے طریقہ سے اللہ میاں کے ہاں ہو جیسے نعوذ باللہ وہ بنئے کا سودا تھا۔

اب اجماع امت کا سوال باقی رہ گیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر اس کے متعلق میں کچھ کہونگا تو وہ ہوز ما (Houtsma) گولڈ زیہر (Goldziher) اور ولہاسن (Wellhausen) کی تحقیق کا نتیجہ ہوگا اور لوگ مجھے مقلد فرنگ سے مطعون کریں گے۔ مگر دل کی بات ہے کہتا ہوں۔

تمام سامی مذاہب میں انھیں تین اوقات کی نماز فرض تھی اور قرآن کا تعین اوقات کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ بہت سے ارکان جو ہمارے یہاں فرائض میں داخل ہیں وہ یہودیوں کی کتاب تالمود میں ملتے ہیں مجوسیوں میں نماز کے پانچ وقت ہیں جو نماز پنجگانہ کہلاتی ہیں (نماز اصل عجمی لفظ ہے اور نمستے کا سنسکرت لفظ اسی لفظ سے نکلا ہے) قرن اولی کے مسلمانوں پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب کہ انھوں نے عرب سے نکلنے کے بعد اپنے ماتحت قوموں یعنی ذمیوں کے مذہب اور عبادات کا موازنہ اپنے مذہب سے کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں کو شدت سے جوش مذہبی تھا وہ یہ نہ گوارا کرتے تھے کہ وہ مذہبی غلو اور تشدد میں ذمی قوموں سے کم رہیں۔ اس لئے جب یہودیوں کے ہاں انھوں نے رجم زانیہ اور ساحرہ اور مرتد دیکھا تو انھوں نے خیال کیا کہ قرآن کا اس بارے میں سکوت کہیں ان کو دوسرے مذاہب کے آگے خفیف نہ کرے۔ انھوں نے فوراً یہ ہی احکام اپنے ہاں لے لئے۔ حتیٰ کہ رجم زانی میں تو انھوں نے قرآن کے منحرف ہونے کا دعوی ہی کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے جب مسیحی راہبوں کو ہر وقت نماز پڑھتے دیکھا اور کو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو حوصلہ ہوا کہ تین وقت کی مختصر نماز قرآن سے بڑھکر ذمی قوموں کو نماز دکھلانی چاہئے اسی زمانے میں ایک فرقہ عرب میں عراق کی سرحد پر پیدا ہوا جس نے اپنے اوپر پچاس وقت کی نماز فرض کرلی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے کھیت جوتنا چھوڑ دیا۔ مزدوروں نے کام کرنا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ابتری پھیل گئی۔ اسپر خلیفہ نے اس فرقے پر دوحکبشی کی اور ان کو منتشر کر دیا۔ مفسرین اور محدثین عموماً عجمی ہیں مشکل سے ایک فیصدی اس میں عرب تھے، وہ لوگ اور خود امام ابو حنیفہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہوکر مجوسیوں سے بھی نماز کم رکھیں اور انھوں نے اسکے لئے حدیثیں وضع کیں اور مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز لاد دی۔ میں نے یہ مختصراً لکھا ہے۔ شائقین اس کی تحقیق کے لئے (   ) کا مطالعہ کریں۔

ارکان نماز میں میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ کیوں نہ یوروپ کا ابو حنیفہ نماز کو ان کی عادت کے مطابق اجتہاد کرے جبکہ قرآن ارکان و تعدیل سے خاموش ہے اس جملے سے میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمام مسلمان اپنے طریقۂ عبادت کو بدل دیں۔

لیکن جب ارکان و تعدیل میں خود حنفی و مالکی جعفری وغیرہ وغیرہ میں اس قدر اختلاف ہے اور پھر صاحب فراش مریض

اور سوار کی نماز میں ارکان وتعدیل پر تشدد نہیں اور حالت جنگ کی نماز کی اور صورت پیدا کی گئی تو اگر میں نے اوپر کا یہ جملہ لکھہ دیا تو (بقول اکبر) ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے۔ وضو کے متعلق تو ابن عباس نے بھی یہی کیا ہے اور تعجب ہے کہ میں قرآن سے مسح پاتا ہوں مگر مسلمانوں کا عمل پیر دہونے کا ہے۔

مولانا نیاز نصاب زکوٰۃ کے بلا تعیین ہونے پر مجھہ سے معترض ہیں۔ میں ان سے یہی کہونگا کہ وہ قرآن کو پڑہیں اور بغور اسکا حکم دیکھیں۔ کیا قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ لوگ تم سے پوچھتے کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہدو کہ جس قدر ہوسکے۔ اسلامی سلطنت میں تعین زکوٰۃ کی مصلحت خواہ کچھہ ہو مگر یہ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص اس سے زیادہ صدقہ وخیرات کرسکتا ہے جتنا فقہا کے نصاب میں ہے۔ مگر اس کو ایسا کرنے پر منحرف اسلام سمجہا جائے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سارا نصاب زکوٰۃ اور عشر (جو کہیں بھی قرآن میں نہیں آیا) وہ سب ہم کو یہودیوں کی "فارملزم" سے ترکہ میں آیا ہے۔ اور میں فارملزم کو قومی مذہب کے لئے جائز سمجھتا ہوں مگر عمومی مذہب کے لئے لغو ولا یعنی کیونکہ اس طرح مذہب صرف چند حرکات جسمانی کا نام ہوجاتا ہے

آخر میں کچھہ میں اپنے ذات کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ ابتدا میں مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی کے درس میں جب کہ میری عمر ۱۰ برس کی تہی شامل ہوا۔ وہ اس وقت مسجد اٹالہ جونپور میں معلم تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ابتدائی اور منتہی طالب علموں کو بلالحاظ ان کی علمیت اور قابلیت کے صبح کے وقت سب کو اپنے گرد ایک حلقہ میں جمع کرتے تھے ہر ایک کے ہاتھہ میں قرآن ہوتا اور ایک قرآن ان کے سامنے کھلا ہوتا تھا۔ ایک طالب علم باآواز بلند قرآن کی ایک آیت پڑہتا تھا۔ اس کے بعد مولانا اس کے معنی اور تفسیر عام فہم عبارت میں بیان کرتے۔ میں نے یہی ان کے اس طریقہ سے فائدہ اٹھایا اور قرآن کی یہ چنگاری میرے دل ایسے وقت ڈالی گئی کہ اگر مسلمان مجھے مارہی ڈالیں کہ تم قرآن روایات سے سمجہا دو تو مجھہ سے یہ ممکن نہیں۔

۴۔ سول لائن میرٹھ
سید مقبول احمد (بی اے)

(**نگار**) مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری رائے پر یہ "اعتذار واحتجاج" تحریر فرمایا اور آپ کا جو مدعا تھا اُسے زیادہ واضح الفاظ میں بیان کردیا۔ "فلسفۂ مذہب" کے سلسلہ میں آپ جو کچھہ لکھ رہے ہیں اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہے، اور میں اس مضمون کو آپ کی دینی خدمت سمجھتا ہوں، لیکن اگر کہیں کہیں مجھے آپ سے اختلاف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ آپ کو اُسے صحیح سمجھنے پر مجبور کروں جس طرح آپ سے میرا اتفاق کرنا ہر مسئلہ میں اور لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہوسکتا آپ نے "مذہب وقومیت" کے سلسلہ میں فقہی مسائل کو چھیڑنے میں جس عجلت سے کام لیا اس کا اقتضا تھا کہ میں بھی قبل از وقت اپنی رائے کا اظہار کرتا، لیکن آپ کے اس "اعتذار واحتجاج" پر اپنی رائے ظاہر کرنے میں جلدی سے کام نہ لونگا، کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوقات نماز کے متعلق اسی اشاعت میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اُسے ملاحظہ فرمائیے۔ نیاز

باب الاستفسار

نماز پنجگانہ ہے یا سہ گانہ

(جناب سید محمد اطہر صاحب۔ خیرپور)

آپ نے اگست کے رسالہ میں سید مقبول احمد صاحب کے مضمون فلسفۂ مذہب پر اظہار رائے کرتے ہوئے اوقات نماز کے متعلق بہت مجمل سی بات لکھی ہے نہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیئے یا تین وقت کی، ہرچند آپ کا رجحان یہی ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہیئے۔ کیا آپ تکلیف فرماکر اس باب میں تفصیل سے اپنی رائے دیں گے۔

(نگار) اوقات نماز کے متعلق نص قطعی یا کلام مجید کا جو حکم ہے وہ نہایت صاف و صریح ہے اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یعنی قرآن سے صرف تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔

سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے:۔

"واقم الصلوٰۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل" (یعنی نماز ادا کرو دن کے دونوں کناروں میں اور کچھ رات گئے) اس آیت میں "طرفی النہار" کے معنی میں اختلاف ہوسکتا ہے اور ہوا، کیونکہ جس طرح طرف کے معنی کنارہ اور حد اخیر کے ہیں اسی طرح وہ حصہ کے معنے میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف تعداد اوقات پر موثر نہیں ہوتا اور اس آیت سے تین ہی وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ دوسری آیت سورۂ بنی اسرائیل میں یہ ہے:۔

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر۔ ان قرآن الفجر کان مشہودا ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک

اس آیت میں "لدلوک الشمس الی غسق اللیل" کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ "نماز ادا کرو" آفتاب ڈھلنے کے وقت سے آغاز شب تک۔ لیکن یہ ترجمہ میرے نزدیک صحیح نہیں، کیونکہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ زوال آفتاب سے آغاز شب تک برابر نماز پڑھتے رہو حالانکہ یہ مقصود نہیں ہوسکتا۔ میری رائے میں اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے کہ:۔ نماز ادا کرو زوال آفتاب کی شام تک۔ یعنی دوپہر ڈھلنے کے بعد ایک نماز پڑھنا چاہیئے، جس کا وقت غروب آفتاب تک ہے۔ اور دوسری نماز صبح کی ادا کرو اور تیسری رات کی۔ الغرض اس آیت سے بھی تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ جن میں سے دو وقت کی تو بالکل صراحت ہے۔ فجر اور عشاء۔ علاوہ ان آیات کے سورۂ نور کی ایک اور آیت سے نہایت صریح طور پر ان دو وقتوں کی تعین ہوتی ہے۔ رسول اللہ کے اوقات خلوت کا تعین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

یاایہا الذین آمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات۔

من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظہیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء الخ

اس آیت میں نماز فجر اور عشاء کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور اس لئے اب بحث صرف یہ رہجاتی ہے کہ تیسری نماز جسے "صلوٰۃ وسطے" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور جو" لدلوک الشمس الی غسق اللیل" سے بھی ظاہر کی گئی ہے اور جو" طرفی النہار" میں بھی موجود ہے کونسی ہوسکتی ہے اور کس وقت تک اس کو ادا کرنا چاہئے۔ سو وہ میرے نزدیک صرف نماز عصر ہوسکتی ہے کیونکہ یہی ایک نماز ہے جو نہار کا ایک طرف بھی ہوسکتی ہے اور جو غروب آفتاب تک ادا کئے جاسکنے کے لحاظ سے "الی غسق اللیل" کی صراحت کو بھی بیکار نہیں جانے دیتی۔

اب رہا یہ امر کہ پانچ وقت کی نماز کیوں اور کب رائج ہوئی، یہ بیشک ذرا دشوار امر ہے۔ صحاح ستہ کی دو حدیثیں ایسی ہیں جو صراحۃً نماز کے پنجگانہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث وہ جو بہ سلسلۂ معراج پچاس وقت کی نماز کو پانچ وقت تک گھٹا دینے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری وہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جبرئیل آئے اور رسول اللہ کے سامنے پانچ وقت کی نماز ادا کی جس کا تتبع ہمیشہ رسول اللہ نے کیا۔ روایتاً ان دونوں حدیثوں میں کوئی سقم ہو یا نہ ہو لیکن درایتاً نا قابل قبول ہیں علی الخصوص اس وقت جبکہ بعض حدیثیں ان کی معارض ہیں۔ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے بحالت قیام وامن صرف تین وقت کی نماز ادا کی

دوسری روایت

سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو دو نمازیں ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ الغرض یہ امر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تعین اوقات ہوگئی تھی، کبھی آپ نے پانچ مرتبہ ادا کی اور کبھی صرف تین مرتبہ البتہ اس کے بعد جب شریعت منضبط ہوئی اور قانون مرتب ہوئے تو پانچ نمازیں فرض مقرر کی گئیں جن کے اوقات حنفیوں کے نزدیک پانچ اور شیعوں کے نزدیک تین ہیں یعنی نمازیں تو ان کے ہاں بھی وہی پانچ ہیں لیکن دو کو وہ ملا کر پڑھتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جسے داخل ایمان واسلام سمجھ لیا جائے اور نہ اس پر زیادہ اعتنا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز علٰحدہ علٰحدہ اوقات میں پڑھتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے میں بھی کلام نہیں اور جو ظہرین ومغربین پڑھتا ہے وہ بھی یقیناً مسلم ہے۔ میں نے سید مقبول احمد صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے جو خیال ظاہر کیا تھا اس کا مدعا یہی تھا کہ ایسے مسائل میں اختلاف وتنقید کی زیادہ ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس کی کوئی تاویل کسی قوم کی عادات ومشاغل کے خصوصیات کو پیش نظر رکھکر نہ کرنا چاہئے کہ اس طرح ہمیشہ کے لئے تاویل کا دروازہ کھل جائیگا اور کبھی کسی مسئلۂ شرعی کی تعیین نہ ہوسکے گی۔

قرآنی پردہ

(جناب سید مقبول احمد صاحب بی اے میرٹھ)

پردہ کے متعلق آپ کا نوٹ مجھے بھی متعجب کرنے والا تھا مگر جب میں نے فلسفۂ مذہب پر آپ کے نوٹ کو پڑھ لیا تو خاموش ہو رہا

خدا نہ کرے کہ آپ قرآن سے اس بدنما برقع کو ثابت کریں جو ہماری عورتوں کو عجوبۂ زمان بنا دیتا ہے۔ ورنہ پھر خدا کا حکم "یغضون ابصارھم" کی ضرورت ہی باقی نہ رہیگی کیونکہ اس خوفناک ہستی کو دیکھ کر خود آدمی کراہت سے اپنی نظر نیچی کر لیگا۔ مولانا عبد الماجد صاحب کا جو قول ہے وہ غالباً ہدایہ کا مشہور مسئلہ ہے اور ابو حنیفہ کی رائے تو یہی ہے کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں۔ اس کے علاوہ مسلم میں سب سے واضح حدیث پردہ کے خلاف یہ ہے کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو عیدین میں نکالا اور مسلمانوں کو اپنی بیویاں بیٹیاں نکالنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ مواعظ نبوی میں عورتیں مساجد میں جمع ہوتی تھیں اور آپ نے ان کو مخاطب کر کے کلام کیا۔ (ممتاز برقی ...)

(**نگار**) اس وقت تک پردہ کے متعلق اور عبد الماجد صاحب دریا بادی کے مضمون کے خلاف جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ:۔

(۱) میرے نزدیک کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتا ہے اور عبد الماجد صاحب کے نزدیک نہیں

(۲) پردہ کا میں مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ کلام مجید اس کا مخالف ہے بلکہ اس بنا پر کہ موجودہ ضروریات زمانہ و تمدن کا اقتضا یہی ہے۔ اب آپ اگر اس کی مخالفت میں یہ فرمائیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں عورتیں باہر نکلتی تھیں، مساجد میں جاتی تھیں مواعظ نبوی میں شرکت کرتی تھیں، تو اس سے میرا قول رد نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں کے باہر نکلنے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ نکلتی ہوں لیکن چہرہ کو چھپا کر اور گھونگھٹ کی اوٹ کر کے۔ عورت کا چہرہ چھپانا علیحدہ امر ہے اور گھر سے باہر نکلنا دوسرا امر، آپ ان دونوں کو کیوں ملا دیتے ہیں۔ رہا موجودہ برقعہ اور اس کی بدنمائی، سو یہ بھی بالکل خارج از بحث امر ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ہندوستان و مصر ایران و ترکی کا کوئی برقعہ ایسا نہیں ہے جو بدنمائی سے بچ سکے تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ کوئی اور حسین و جمیل اختراع کر کے عورت کے چھپے ہوئے چہرہ کا بدل پیش کیجئے اور لوگوں کی دعوت نظر کا سامان پیدا کیجئے، کون منع کرتا ہے۔ لیکن اس کو اصل مسئلہ کیساتھ ملا کر مغالطہ نہ پیدا کیجئے۔

اب میں پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ابو حنیفہ چہرہ کو کھلا رکھنے کے قایل ہوں یا نہ ہوں، حدیثوں میں خواہ کچھ ہو میں ان سے بحث نہیں کرتا، میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کلام مجید میں ضرور چہرہ چھپانے کا حکم موجود ہے۔

اگست کے ملاحظات میں، عبد الماجد صاحب کی رائے کے خلاف میں نے مختصراً ظاہر کیا تھا کہ "یدنین علیھن من جلابیبھن" سے چہرہ پر نقاب ڈالنے کا حکم صراحتہً ثابت ہوتا ہے۔ اور آج بھی یہی کہتا ہوں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس باب میں میری مخالفت کرے تو اس کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ احادیث کا حوالہ دے یا قول ابو حنیفہ سے تمسک کرے بلکہ اس کو چاہئے کہ کلام مجید ہی سے میری غلطی کو ظاہر کرے۔ افسوس ہے کہ آپ نے بھی یہ نہیں کیا اور اسی قسم کا جواب دیا جو میرے استدلال کو کسی طرح رد نہیں کر سکتا۔

کلام مجید کی اس آیت میں لفظ " جلباب " کا آیا ہے جس کے معنے اگر آپ نقاب کے نہیں تو کم از کم اوڑھنی یا سر کی چادر کے تو ضرور لیں گے جسے عربی میں خمار کہتے ہیں، اچھا اب خمار کے متعلق بھی ملاحظہ کیجئے کہ سورۂ نور کے چوتھے رکوع میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔" قل للمومنات یغضضن من ابصارھن .... ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن الخ

اس آیت میں تین باتوں کی ہدایت کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ راستہ چلنے میں اپنی نگاہ نیچی رکھیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر وہ حصہ جو مجبوراً ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں سر سے گریبان تک لٹکا لیا کریں۔

پہلا حکم نگاہ نیچی کرنے کا اس لئے ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر محرم عورتوں کا دیکھنا درست نہیں اسی طرح عورتوں کو بھی چاہئے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھیں، دوسرا حکم زینت کے چھپانے کا ہے مگر وہ حصہ زینت کا مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جس کا چلنے میں ظاہر ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ " الا ما ظھر منھا " سے استثنا زینت کا کیا گیا ہے نہ کہ کسی عضو یا حصۂ جسم کا مقصود یہ ہے کہ بناؤ سنگھار نہ دکھائیں مگر اس قدر جس کا چلنے میں ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے، خواہ وہ ہاتھ پاؤں کا زیور ہو، قامت کا حسن ہو، یا وضع ولباس کی چھب ہو اس استثنا سے چہرہ یا ہاتھ پاؤں کی بحث پیدا کرنا ہی میرے نزدیک بالکل خلاف اصول ہے۔

سورہ نور کی اس آیت میں الفاظ " و لیضربن بخمرھن علی جیوبھن " خاص طور پر قابل غور ہیں۔ خمر، جمع ہے خمار کی اور خمار عربی زبان میں اس چادر یا اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر پر ڈالی جاتی ہے۔ اوڑھنی اوڑھنے کا عام اور فطری طریقہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پشت سے اس کو لاکر سر پر ڈال لیا جائے نہ یہ کہ چہرہ کی طرف سے اُسے لایا جائے اور پیٹھ کو ننگا کر دیا جائے۔ پھر جب اوڑھنی اوڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ پیٹھ کی طرف سے لاکر اسے سر پر ڈالا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کے لٹکانے کا حکم اگر ہو سکتا ہے تو صرف چہرہ ہی کی طرف جو کھلا ہوا تھا نہ کہ پیٹھ جو پہلے ہی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ علاوہ اس کے اگر جیوبھن (گریبانوں) سے مراد موجودہ فراک کا وہ گریبان نہیں ہے جو پشت کی طرف ہوتا ہے اور جسے عام طور سے انگریزوں کے بچے استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قمیص کا گریبان ہے تو یہ امر آپ سے بھی مخفی نہ ہوگا کہ وہ گریبان آگے ہی کی طرف ہوتا ہے اور جب اوڑھنی وہاں تک لٹکائی جائیگی تو چہرہ خواہ مخواہ چھپ جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ چہرہ کو کھلا رکھتے ہوئے صرف اوڑھنی کا آنچل گریبان اور سینہ تک لیجاؤ تو اس کی تردید سورۂ احزاب کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں الفاظ "یدنین علیھن من جلابیبھن" استعمال کئے گئے ہیں اور جن میں " یدنین " کا لفظ لٹکانے کے مفہوم میں صراحتہً موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ پردہ کا مقصود صرف مرد و عورت کے باہم اختلاط یا اس کے محرکات کو روکنا ہے کہ اس میں اندیشہ فساد اخلاق کا ہے اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ عورت ہو یا مرد اس کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جس کو دیکھنے کے بعد جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، اس لئے اوڑھنی سے اگر کسی حصۂ جسم کے چھپانے کا حکم ہو سکتا تھا تو اُسی حصہ کا جو سب سے زیادہ باعث فتنہ و فساد ہے، نہ کہ گریبان یا پشت یا ہاتھ پاؤں وغیرہ جن پر مرد کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ چہرہ کو داخل ستر کرنے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت بیکار تھی کیونکہ اس صورت میں وہ راستہ کیونکر طے کر سکتی تھیں تو اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثر ہندو عورتیں باہر گھونگھٹ ہی کرکے نکلتی ہیں اور تمام کام انجام دیتی ہیں۔ یا اگر موجودہ چار شف ہی کو لے لیا جائے جس میں صرف ایک ہلکا سا ریشمی نقاب چہرہ پر پڑا رہتا ہے تو بہت کچھ عورت کی جیب ہی ظاہر ہو سکتی ہے، جس کے چھپانے پر آپ راضی نہیں اور "یدنین علیھن من جلابیبھن" کی بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو بحث ہوئی حصۂ اول سے۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ میں کلام مجید میں یہ احکام تسلیم کرتے ہوئے کیوں اس وقت پردہ کا مخالف ہوں، اس کے متعلق میں ایک سے زاید بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور اس پر آپ کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو کرنا بے محل ہے۔

نیاز

فردوسی شہزادی

سن اے فردوسی شہزادی — عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو کرنوں کے جھولے میں
گاتے گاتے اکتا جائے
دنیا کے افسانے سن کر
تیرا دل کھویا سا جائے
جب انسانوں کی محفل کا
منظر تجھکو یاد آجائے
تیری ہنگامہ گر "فطرت"
تنہائی سے گھبرا جائے!

میرے گلشن میں آجانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو؟ میرا گلشن
تیری جنت سے بھی پیارا
عشق کی لہریں ذوق کی موجیں
پریم کی نہریں پریت کے دریا
زریں پھولوں کی اک محفل
رنگیں کلیوں کی اک دنیا
پاک فضا معصوم ہوائیں
حسن کی عصمت کا گہوارہ

عشق کی عظمت کا کاشانہ — عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو اس گلشن میں
گھوما کرتے تھے ہم دونوں
مستِ بادۂ الفت ہوکر
جھوما کرتے تھے ہم دونوں
پھر ان پاکیزہ کلیوں کو
چوما کرتے تھے ہم دونوں

وہ مل جل کر نغمے گانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

ان باتوں کا ذکر ہی اب کیا

خواب تھا — اور کیا خواب کی قیمت
ہاں — دیر قدس کی دیوی
ہے گر کچھ احساس محبت!
آ — کہ ترے قدموں میں لٹا دوں
ذوق کی رفعت شوق کی عظمت
باغ میں دیکھونگا تیرا رستہ
شام ہی سے اے لیلیٰ الفت

صبح سے پہلے ہی آجانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

اس گلشن کے دروازے پر
اک خوش قسمت مالی ہو گا
دل میں ہو گا جوش محبت
ہاتھ میں ہو گا پریم کا گجرا
شرم سے جھک جائینگی آنکھیں
تونے گر الفت سے دیکھا
اٹھے گا دامن میں لیکر
پریم کا گجرا - نذر تمنا

خدمت کرنا دل نہ دکھانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو گجرا پہن چکے گی
وہ تیرے قدموں میں جھکے گا
تونے گر الفت سے پوچھا
وہ تجھ سے کچھ عرض کرے گا
ہاتھ بڑھا دینا شہزادی
وہ خوش ہو کر بوسہ دے گا

اس شوخی پر مت شرمانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا

وہ مالی ہو پر ہی تیرا
میں کیوں اس کا نام بتاؤں
ہاں جو کوئی "رنگین وعدہ" ہو
شاید! میں پھر کچھ نہ چھپاؤں
کہدوں - میں تیرا ہی روش ہوں
اور وہی مالی بن جاؤں
تو جو نگاہ ناز سے دیکھے
تیرے دامن میں چھپ جاؤں

ہنس دینا باتوں میں لگانا — عہد وفا کو بھول نہ جانا (روش صدیقی)

دین کے مبلغ

اک زمانہ تھا کہ یورپ میں مبلغ دیں کے
وضع کرتے تھے مذاہب کے خطرناک اصول

لغو اقوال کو آیات خدا کہتے تھے
نہ کوئی جنکی سند تھی نہ کوئی شانِ نزول

انکو تاویل مسائل میں جو حاصل تھا کمال
طبقۂ ملک میں ہونے لگے اکثر مقبول

فرقہ بندی بھی کی اور تفرقہ اندازی بھی
مخمصے اور بھی پیدا کیے دنیا میں فضول

قبضۂ دیں سے مراد ان کی تھی دنیا طلبی
کہ کسی طور سے ملتی رہے دولت معقول

نذر آتش کیا لاکھوں کو نظر نے ان کی
اور فتوؤں سے ہوئے ان کے ہزاروں مقتول

پھر حکومت کے ہر اک شعبہ میں رہبر بنکر
بادشاہوں کی خوشامد کو بنایا معمول

دین کی طرح حکومت کو کیا زیر و زبر
کیونکہ انہیں نہ فراست تھی، نہ دانش نہ اصول

دام تزویر میں انسانکو پھنسا رکھا تھا
اور وہ قسمت ہی پہ کرتا رہا اسکو محمول

جب جہالت سے ہوئی فطرت انساں آزاد
کر چکے تھے یہ خرافات طبیعت میں حلول

چشم انسانکو ہوئی راہ حقیقت کی تلاش
بولے افراد کہ خود ساختہ ہیں دیں کے اصول

تنگ مذہب یہ عقائد ہیں عیاذاً باللہ
خواہ کچھ ہو مگر ہم ان کو کرینگے نہ قبول

ہاتھ میں واعظِ دین کے نہیں جنت کی کلید
عرش سے اسکا جہاں میں نہیں ہوتا ہے نزول

آتش غیض و غضب دل میں ہوئی شعلہ فروز
کیونکہ ہر شخص تھا ان نفس پرستوں سے ملول

حق و باطل میں جو ہونے لگی انسانکو تمیز
پھر کسی پر نہ ہوئی ان کی توجہ مبذول

محمود اسرائیلی

غزلیات

اثر رامپوری

گر بے نقاب حسن خود آرا کرے کوئی
دنیائے شوق کو تہ و بالا کرے کوئی

پھر دل میں ہے نظارۂ پیہم کی آرزو
پھر دل پہ بجلیاں سی گرایا کرے کوئی

رسوا کریں نہ میری نگاہیں مجھے خدا
دیکھوں میں جب کسی کو نہ دیکھا کرے کوئی

ہنستی ہے عقل بھی مری حال تباہ پر
پھنکتا ہو گھر کسی کا تماشا کرے کوئی

یکساں ہے اضطراب میں وصل و غم فراق
کس طرح چارۂ دل شیدا کرے کوئی

دیدار ہو اگر ترا ممکن تو بے خطر
سو عمر وقف تمنا کرے کوئی

بس اے ہجوم یاس کہ دلمیں تواں نہیں
تاکے امید وعدۂ فردا کرے کوئی

سویا ہوں گور میں ترے غم کو لئے ہوئے
ٹھوکر سے اپنی حشر نہ برپا کرے کوئی

پاس ادب سے جرأت اظہار گو نہ ہو
صورت ہو خود سوال تو کیا کرے کوئی

دل میں ہو نور عشق تو سینہ ہو کوہ طور
رگ رگ میں دید برق تجلا کرے کوئی

دنیائے آرزو میں نہ ہلچل پڑے اثر
ہم کو نہ ایسے ناز سے دیکھا کرے کوئی

تبسم نظامی

عشق حقیقی غالب ہے عشق مجازی کون کرے
اپنی فطرت عالی ہے دنیا سازی کون کرے

عیسیٰ ہیں اور گردوں پر حسن ہے اور سو پردوں میں
الفت کے بیماروں کی چارہ سازی کون کرے

نکہت گل کی سرگوشی باد صبا کو بار نہیں
اب غمازی مشکل ہے اب غمازی کون کرے

طور اور ان کی جلوہ گری اور چشم کلیم
تاب کی ساری باتیں ہیں ہرزہ تازی کون کرے

مفت کا میری آنکھوں کو رونا دھونا رہتا ہے
آنکھ میں ان کے لطف نہیں اشک نوازی کون کرے

بستی کی اس بستی میں کوئی خدا بھی بن جاتا
سب بندے ہی بندے ہیں بندہ نوازی کون کرے

ہائے تبسم وحشت نے رنگ ترنم چھین لیا
گلشن میں شاخ گل پر نغمہ طرازی کون کرے

حافظ غازیپوری

میری نظر میں ہو وہی حسن، طلسم خواب کا — یاد ہو آج تک مجھے، دور ترے شباب کا
گرم روِ صراطِ عشق، دیدۂ تر نچوڑ کر — تشنگی الم بجھا، خوف نہ کر سراب کا
پھیل گیا فضا میں جو، صوت شکستہ کی طرح — درد کی اک صدا ہو وہ، نغمہ نہیں رباب کا
چشم خمار آشنا، وقف تحیرات ہے — جوشِ شباب حسن میں، کیف ہو اک شراب کا

حافظ درد آشنا، ختم کر اپنی داستاں
قابل اعتنا نہیں حال دل خراب کا

حسام کاکوروی

مے الفت کبھی برباد کن ہوش نہیں کو — یہ وہ صہبا ہے جو مست کش مے نوش نہیں
اسپہ بگڑے ہوئے ہو ضبط فغاں نہ ہو سکا — میں خطا کار سہی تم بھی خطا پوش نہیں
تم مجھے بھول چکے ہو تو مجھے کیا حاصل — مجکو میرا ستم آرا - تو - فراموش نہیں
میری آنکھوں سے ترا جلوہ کبھی چھپ سکا — حسن جو شئے ہے پس پردہ بھی روپوش نہیں
شوق خود شعلہ نوازی کا سزاوار تو ہو — آتش حسن ضیاء پاش ہے روپوش نہیں
بزم میں آنے تو دو - شکر جفا کرنا ہے — اور جو کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
خیر میخانہ کی لبریز ہیں جلوے لاکھوں — کون قطرہ ہے کہ جو میکدہ بردوش نہیں

للہ الحمد کہ دل سوز ابھی باقی ہو حسام
شمع تربت سر تربت ابھی خاموش نہیں

فرخ بنارسی

حسنِ محشر خیز جب بیداد پر مائل ہوا — ذرہ ذرہ خاکِ عاشق کا ستمگر دل ہوا
دیکھنے کو یوں تو دیکھا بے نقاب انکو مگر — چشم حیران سے کوئی پوچھے کہ کیا حاصل ہوا
ذوقِ عصیان اب زیادہ رنجِ محرومی نہ دے — جس قدر حسنِ عمل تھا دفتر باطل ہوا
ضبط آئین محبت ہے محبت میں مگر — اوتنی ہی راحت ملی بیتاب جتنا دل ہوا

جو محیط عشق میں ڈوبا نہ ابھرا حشر تک   آشنا ساحل سے کب بیگانۂ ساحل ہوا
عام ہے جلوہ مگر انکو مبھی کو ہے حجاب   شکر ہے ان کی نظر میں بھی میں قابل ہوا

کام آئی ایک دن فرخ مری افتادگی ہو
ضعف سے، راہ طلب میں ہر قدم منزل ہو

جناب محمود علی خانصاحب محمود رئیس الہ آباد

دل کی سب راحتیں مٹتی ہیں تو مٹ جلنے دو   نقش الفت کو تو مضطر ابھر آنے دو
حشر ہے حشر، پلٹ آؤ شہیدانِ وفا   کچھ ذرا اور انہیں آج تو شرمانے دو
خود نکل آئیگی ہر موج سے اک راہِ فنا   کشتیٔ عمر کو ساحل سے تو ٹکرانے دو
جوش الفت میں کٹی جاتی ہیں خود دو رگیں   دھار تلوار کی مڑتی ہے تو مڑ جانے دو
اک مرا قتل ہے اور بعد میں انکی حیرت   بزم غم کے ہیں یہی خلق میں افسانے دو
دیکھنا دیکھنا اس راہ سے جانا نہ ابھی   شیشۂ دل کو مرے اور بھی بس جانے دو

پتیاں پھولوں کی خود دھول نہیں گی محمود
ان کے ہاتھوں میں ذرا انکو بکھر جانے دو

اقتباسات علمیہ

اعادۂ شباب اس وقت تک یہ امر حقایق ثابتہ میں داخل تھا کہ ؎

جو آکے نہ جائے، وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن عہد ماضی کے جس طرح اور بہت سے نظرئے اب معرض بحث میں ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اور بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا انسان صرف یہ سوچتا رہتا ہے کہ خدا معلوم کس وقت موت آجائے اور یوروپ کا انسان ابھی تک قدرت کے فیصلۂ شیب ہی پر قانع نہیں۔ اور جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ بعض درخت سو سو بلکہ ہزار سال تک قایم رہتے ہیں، بعض حشرات آبی (مثلاً گھونگھا) دو دو سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ لیکن انسان جسے اشرف المخلوقات ہونے کا فخر حاصل ہے ۴۰ سال کی عمر سے ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور ساٹھ، ستر تک پہونچکر فنا ہو جاتا ہے تو اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور فطرت کے اس اصول کے خلاف ایک قسم کی بغاوت محسوس کر کے اس جستجو میں لگ جاتا ہے کہ بڑھاپے کی حقیقت معلوم کرے اور قدرت کا مقابلہ کر کے اپنی عمر طبعی کو بڑھائے۔

نگار کے صفحات میں اس سے قبل بارہا اعادۂ شباب کے نہ صرف امکان بلکہ اس کے وقوع کا ذکر آچکا ہے اور بعض غدود کے بدل دینے سے جو کامیابی یوروپ کے ڈاکٹروں نے حاصل کی ہے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حال میں ڈاکٹر کرو (Crew) نے جو علمی و عملی بحث اس موضوع پر پیش کی ہے وہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتا ہے کہ "انسان بھی ہر جاندار کی طرح ایک چھوٹے سے جرثومہ (کیڑے) سے پیدا ہوتا ہے جسے غذا آہستہ آہستہ بڑھاتی ہے، ایک خاص شکل وصورت دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ترقی کرتے کرتے ایک ذی عقل و ہوش، صاحب علم و فراست فرد ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد اس کا نمو رک جاتا ہے، علامات شیب ظاہر ہونے لگتے ہیں قوت عمل ضعیف ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ حیات و اعمال حیات محدود ہو جاتے ہیں۔ ایک جاندار جسم کے اندر ہمیشہ خلایا مٹتے اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ شباب میں جتنے خلایا مٹتے ہیں ان سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیب میں اسکے بالکل برعکس ہوتا ہے یہاں تک کہ جب جدید خلایا بننا بند ہو جاتے ہیں تو فنا ہو جاتی ہے۔

اب یہ رائے مسلم ہے کہ جسم میں جدید خلایا کا نہ بننا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ زہر یلے مادہ کا جو جسم میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اعضا، جو جسم کے کثیف مادہ کو خارج کرتے رہتے ہیں (مثلاً امعا، پھیپھڑے، گردے، جلد) اپنا پورا کام نہیں کرتے اور زہر جمع ہو کر خلایا کو زیادہ فنا کرنے لگتا ہے۔ پھر جب غور کیا جاتا ہے کہ یہ اعضا اپنا پورا کام کیوں نہیں کرتے تو لامحالہ خون کی روانی کی طرف نگاہ

جاتی ہے جس پر انحصار ہے تمام اعضاء کے افعال کا، یعنی خون صالح جس قدر وسعت وکثرت کے ساتھ اعضاء کو پہونچتا رہیگا وہ اتنی ہی تکمیل کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن خون صالح کا انحصار ہے ان غدود پر جو جسم کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے کوئی خاص مادہ نکل کر خون میں ملتا رہتا ہے اور اس کو صاف رکھتا ہے

یہ غدود کون کون سے ہیں:۔ غدۂ درقیہ، غدۂ صعتریہ، غدۂ نخامیہ غدۂ صنوبریہ، گردوں کے اوپر کے غدود اور غدود جنسیہ (یعنی خصیتین) ان تمام غدود سے ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ پیدا ہو کر خون میں ملتا ہو اور خون کے ذریعہ سے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے اس کا تجربہ غدود کے نکالنے اور پھر ان کی جگہ قایم کر دینے سے کافی طور پر ہو چکا ہے۔

پھر جس طرح اور امراض ان غدود کے ضعف سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بڑھاپا بھی جو یقیناً ایک مرض ہی ہے، پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج ان غدود ہی کی تبدیلی سے ہونا چاہئے۔

سب سے پہلے ۱۸۴۹ء میں ایک خصی مرغ پر اس طرح کا عمل جراحی کیا گیا اور ایک دوسرے مرغ کے خصیے اس میں لگا دیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خصی مرغ نے پھر نر حالت اختیار کر لی اس کے ۴۰ سال بعد فرانس کے ایک ڈاکٹر نے جس کی عمر ۷۲ سال کی تھی جانور کے خصیہ کا جوہر نکال کر اپنے جسم میں پچکاری کے ذریعہ سے پہونچایا تو اس کی قوت حیوانی و دماغی میں بہت اضافہ ہو گیا جب اس نے اپنے اس تجربہ کا اعلان کر دیا تو اس قدر ہجوم بڈھے آدمیوں کا اس کے پاس ہوا کہ گھبرا کر لندن چلا گیا ہر چند اس بیان میں صحت کا شائبہ کم ہو کیونکہ اول تو خصیہ کا جوہر حاصل کرنا آسان نہیں، دوسرے یہ کہ پچکاری کے بعد ہی فوراً اس قدر فائدہ مترتب ہونا خلاف اصول ہو، اس کے لئے کچھ زمانہ گزرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ ضرور ہوا کہ ایک اصولی بحث شروع ہو گئی اور ڈاکٹروں کو اس طرف توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں عملی صورت سے جو نتایج پیدا ہوے وہ یہ تھے کہ اگر کسی ضعیف جانور میں مادۂ منویہ کی دونوں رگیں بدل دیجائیں تو وہ جوان ہو جاتا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اگر غدود سے اس کا مادۂ کیمیاوی نکلنا بند ہو جائے یا کم ہو جائے تو دوسرے غدود بدلدینے سے پھر اصلی حالت عود کر آتی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے چھوٹے چوہوں کو خصی کیا اور وہ بیکار ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے چوہوں کے خصیے پھر پیوند کئے اور پھر اصلی حالت پر آ گئے۔ اسی طرح اس نے چوہیاں لیکر ان کے خصیے (مادہ کے خصیوں کو مبیضہ کہتے ہیں) نکالے تو ان کا میل جنسی جاتا رہا۔ اور جب پھر مبیضہ پیوند کئے تو وہ اصلی حالت پر آ گئیں اس کے بعد نر کے خصیے مادہ کے مبیضے نکال کر اس میں پیوند کئے تو اس میں نر کے صفات پیدا ہو گئے اور مادہ کے مبیضے نر کے خصیے نکال کر اس میں لگائے تو وہ مادہ ہو گیا۔ اسی طرح اس نے بغیر خصیے اور مبیضے نکالے ہوے نر میں مادہ کے مبیضے اور مادہ میں نر کے خصیے لگائے تو وہ مخنث ہو گئے بعض ایسے آدمیوں پر بھی تجربہ کیا گیا جنکے خصیے جنگ میں جاتے رہے تھے تو وہ پھر با کار ہو گئے

ان مباحث وامثال پر بنیاد رکھ کر استناخ اور ورونوف دونوں ڈاکٹروں نے بہت سے تجربے کئے اول الذکر نے صرف غدود بدلکر اعادۂ شباب کی کوشش کی اور دوسرے نے خصیے تبدیل کئے لیکن استناخ کا طریق عمل زیادہ آسان تھا۔ کیونکہ جانوروں کے غدود آسانی سے ملسکتے ہیں۔

یہ ذکر ہے اب سے ۲۵ سال قبل کا، لیکن گزشتہ ربع صدی کے اندر جہاں اور بہت سے جدید علمی تجربات تکمیل کو پہونچے ہیں

انھیں میں سے ایک یہ بھی اور اب غدود بدل کر اعادۂ شباب کا عمل نہایت معمولی عمل جراحی ہوگیا ہے۔

ہر چند ابھی تک اتنی کامیابی نہیں ہوئی کہ غدود بدل جانے کے بعد ایک ضعیف ہمیشہ کے لئے جوان ہو جائے اور پھر اس کو دوسرے غدود کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یقینی ہے کہ ایک مرتبہ غدود کی تبدیلی سے انسان بیس سال پیچھے ہٹ جاتا ہے اور میرے خیال میں فطرت کے خلاف انسان کی یہ جنگ کچھ کم کامیاب نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ چلکر اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور انسان اپنی ۱۲۰ سال کی عمر طبعی کو پہونچ سکے۔

سنیما یا صور متحرکہ

اب سے ۱۰ سال قبل سنہ ۱۹۱۰ء میں سنیما بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور صرف لہو و لعب سمجھا جاتا تھا لیکن دس سال کے اندر ہی اس صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ اب امریکہ میں موٹر کی صنعت کو چھوڑ کر اس کا چوتھا درجہ ہے اور اس کی کمپنیوں کے حصے نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ تک دنیا میں ۴۰۰۰۰ مستقل عکاس خانے (Cinema Houses) قائم ہو چکے تھے، ۸۰۰ اسپین میں ۱۰۰۰ اٹلی میں، ۱۰۰۰ فرانس میں ۲۷۰۰ جرمنی ۲۰۰۰ بلاد انگلستان میں ۵۰۰۰ امریکہ میں ۱۷۰۰۰ [illegible]یا میں ۷۰۰ سویڈن میں اور ۶۰۰ جاپان میں تھے۔ لیکن اب مغرب میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کوئی عکاسخانہ نہ ہو، خواہ وہ مرکز تہذیب و مدنیت سے کتنی ہی دور کیوں نہ واقع ہو۔

جنوبی امریکہ میں یہ حالت ہے کہ ہر وہ گاؤں جس کی آبادی ایک ہزار تک پہونچتی ہے، ایک عکاسخانہ رکھتا ہے۔ یہ مختصر سا بیان تھا اس کی صنعت کی وسعت کا۔ اب رہی اس کی مقبولیت سو اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ میں امریکہ کے اندر روزانہ ایک کرور آدمی عکاسخانوں میں جاتے تھے اور اب مسٹر ولیمائز سنیما کمپنی کا ایک ڈائرکٹر کروڑپتی انسان سمجھا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ میں سنیما [illegible]ں کی آمدنی گیارہ کرور گنی ہوئی تھی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ۴۴ کرور گنی۔ اس صنعت میں جو سرمایہ سنہ ۲۵ تک لگا تھا اس کا اندازہ [illegible] کرور گنی کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کے اشتہار پر صرف ایک سال میں ایک کرور ۲۰ لاکھ گنی کمپنیوں نے صرف کئے اور ۵۰ لاکھ [illegible]یادہ آدمی ان میں کام کرتے ہیں۔

اب سنیما سے صرف لطف و تفریح کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ اب وہ بہترین ذریعہ تعلیم اطفال کا، سیاسی پروپگنڈا کا اور تجارتی اشتہاروں کا ہے۔ امریکہ کی وسعت تجارت و صنعت کا ایک بڑا راز اس کی صنعت سنیما بھی ہے۔ جس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اس کے ملک کی پیداوار، اس کی صنعت و تجارت کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ بازاروں میں وہاں کی اشیاء بہو بجکر مقبول ہو رہی ہیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۷۵ فی صدی فلم (Film) امریکہ کی کمپنیوں کے رائج ہیں اور اور اس لئے نہایت آسانی سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس وقت امریکہ ۷۵ فیصدی دنیا کے بازاروں پر بھی قابض ہے

کائنات کی عظمت

یہ غالباً سب کو معلوم ہوگا کہ زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہے اور اس کے شب و روز پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور کی گردش پوری کر لیتا ہے اور اس کا سال اور فصلیں یوں

بنتی ہیں کہ ۳۶۵ اور تقریباً چوتھائی دن میں آفتاب کے گرد اس کی گردش پوری ہوتی ہے۔ خود زمین کا کرہ ۲۴ ہزار میل کے دور کا ہے یعنی اگر ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کیا جائے تو ایک مہینے میں اس کو طے کر سکتے ہیں۔ لیکن آفتاب زمین سے ۱۳۳۱۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور زمین ایسے ۳۰۴۳۳۳۳ کرے اس سے بن سکتے ہیں۔ لیکن عالم کون میں آفتاب بھی باوجود اتنی عظمت کے ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آنکھ سے نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف ۶۰۰۰ ہے، لیکن بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے جن ستاروں کی تصویر لیجا سکی ہے ان کی تعداد ۲۲۴ ملین ہے اور یہ سب کے سب اس نظام کے ہیں جسے کہکشاں کہتے ہیں۔ کہکشاں میں بظاہر ستارے بہت قریب قریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بُعد کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے ورنہ حقیقت میں ان کے درمیان باہم بہت بڑا فصل ہے

ڈاکٹر ہبل نے الواح تصویر میں جو ۱۰۰ انچ کا شیشہ رکھنے والی بڑی دوربین میں لگائی گئی تھیں دو ملین اجرام سدیمی کا شمار کیا ہے جو ۱۴۰ ملین نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں (یعنی ان کی روشنی ایک کرور ۴۰ لاکھ سال کے بعد ہم تک پہونچتی ہے) یہ اجرام کائنات میں ایک دوسرے سے اس قدر بعید واقع ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸ لاکھ سال کے بعد پہونچتی ہے۔ ان میں سے ہر سدیم میں اتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے آفتاب کے برابر لاکھوں آفتاب اس سے بن سکتے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ ہمارا آفتاب بھی نجوم کہکشاں ہی میں سے ایک تارہ ہے، اور تمام وہ ستارے جن کی تعداد ۲۲۴ ملین بتائی گئی ہے وہ بھی سب اسی کہکشاں سے تعلق رکھتے ہیں اور کہکشاں خود ایک سدیم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی)

ڈاکٹر ہبل نے ان سدیموں کی رصد کر کے معلوم کیا ہے کہ وہ حالت نشو و ارتقا میں ہیں اور تدریجی طور پر ایک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ ان کا مادہ بھی ایک ہی ہے اور باہم بُعد بھی یکساں ہے (یعنی ۱۸ لاکھ نوری سال کا فاصلہ) اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سدیم کسی ایک ہی سدیم سے پیدا ہوئے ہیں۔

غذا کا اثر قامت پر

غذا سے جسقدر انسان کی صحت و نمو کا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں حال ہی میں علماء کی ایک جماعت نے پوری طرح تحقیق کر کے اس کو ثابت کیا ہے کہ غذا انسان کی قد و قامت پر بھی بہت اثر کرتی ہے چنانچہ اہل چین، جاپان، کوریا، جاوا وغیرہ کا پست قد ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کی غذا چاول ہے اور اہل افریقہ و یورپ کا دراز قد ہونا بھی ان کی مخصوص غذا کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کی غذا بدل دیجائے تو کیا ان کی قد و قامت میں تغیر ہو سکتا ہے؟

اس امر کے تجربہ کے لئے چوہے پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا جسم اور صفات زندگی بہت کچھ اس کے طعام کیمیاوی کی ترکیب پر منحصر ہیں۔ اور غذا اور اس کے اثر کے متعلق جو تجربے کئے جا سکتے ہیں ان کا اظہار اس کی حالت سے بہت کچھ ہوتا ہے پھر چونکہ وہ ایسا جانور ہے جو گوشت بھی کھاتا ہے اور نباتات بھی اس لئے وہ اس باب میں انسان سے بہت مشابہ ہے اس کے

ساتھ ہضم وغیرہ کے لحاظ سے بھی وہ ہضم انسانی سے مماثل ہو۔ اس لئے اس کو تجربہ کے لئے زیادہ موزوں سمجھا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی تبدیلی سے اس کے اندر بہت سے تغیرات پیدا ہوئے۔

ایک مرتبہ آٹھ چوہیاں لیکر ان کے دو حصے علٰحدہ علٰحدہ کئے گئے ایک کو معین مقدار پانی اور گیہوں کی دی گئی اور دوسرے کو اسی غذا کے ساتھ شلغم کی پتی بھی دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اول جماعت بڑے چوہوں کے برابر ہوگئی اور دوسری ان سے دو چند جسامت کی ہوگئی۔

اس مسئلہ میں علمائے جاپان نے بھی متفرق تجربے کئے۔ بعض مدرسوں کے طلبہ کو وہی غذا دی گئی جو یورپین ممالک میں دیجاتی ہے اور جو جاپانیوں کے مخصوص ملکی غذا سے بالکل مختلف ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان طلبہ کا قد کئی انچ بڑھ گیا اور اسی طرح وزن بھی زیادہ ہوگیا۔ کرنل مارسین لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ایک طرف سکھوں اور پٹھانوں کی قدوقامت کو دیکھئے اور دوسری طرف مدراسیوں کے جسم کو تو تعجب ہوگا، حالانکہ معیشت و معاشرت یا افلاس و عسرت میں یہ سب برابر ہیں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی غذاؤں میں فرق ہے۔ چنانچہ کرنل مارسین نے بعض چوہوں کو علٰحدہ رکھکر وہ غذا دینی شروع کی جو سکھ اور پٹھان استعمال کرتے ہیں اور بعض کو وہ جو مدراسی کھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ چوہے مدراسی چوہوں سے جسم میں بڑھ گئے اس کے بعد چوہوں کی متعدد جماعتیں کرکے مختلف ممالک کے لوگوں کی غذا علٰحدہ علٰحدہ دی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی غذا کھانے والے چوہے بڑے جسم کے ہوگئے اور ان کی جلد نرم نرم ہوگئی، اور جن چوہوں کو جاپان کی غذا دی گئی اُن کے جسم چھوٹے رہگئے۔

بہرحال یہ امر تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غذا کا اثر انسان کی جسم و صحت اور اس کے دماغ پر بہت کافی پڑتا ہے اور اگر اس پر توجہ کی جائے تو بہت سے امراض بھی دور ہو سکتے ہیں۔

آفتاب کے متعلق ایک جدید رائے

یہ ہے کہ آفتاب ہر جہت میں یکساں نور و حرارت و کہربائیت نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ منحصر ہے دوسرے سیاروں کے اجرام پر، ان کے اجتماع و تفرق پر اور اس قوت جذب پر جو آفتاب و راس کے تابع ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شعاعیں بھی بالکل مادی چیز کی طرح قوت جذب سے متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جب زمین، مشتری سے قریب ہوتی ہے تو آفتاب اور زمین کے درمیان تجاذب بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اس وقت روشنی، حرارت اور کہربائیت ہر چیز میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ اقتران بارہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔

علمائے ہیئت واقف ہیں کہ ہر گیارہ یا بارہ سال کے بعد آفتاب میں بہت بڑا داغ نمایاں ہوتا ہے جو کرۂ زمین کی فضا میں نمایاں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جب زمین اور مشتری کا قران ہوتا ہے اسیوقت یہ داغ نمایاں ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۹۲ء، ۱۹۰۳ء، ۱۹۲۵ء میں کرۂ زمین اور مشتری کا قران ہوا اور آفتاب کا داغ بھی انہیں سالوں میں نمودار ہوا۔

اسی طرح ستاروں کی روشنی میں بھی بہت اختلاف محسوس کیا جاتا ہے۔ وہی ایک ستارہ جو ایک زمانہ میں بہت روشن نظر آتا ہے

دوسرے زمانہ میں دھندلا ہوجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت کسی ستارہ کے گرد کوئی تاریک ستارہ گردش کرنے لگتا ہو تو وہ درمیان میں آکر کسوف پیدا کردیتا ہو لیکن یہ تاویل تمام ستاروں میں کام نہیں دے سکتی، اس لئے جدید نظریہ یہ قایم کیا گیا ہو کہ جب کسی ستارہ کے ماتحت تارے اس کے گرد زیادہ جمع ہوجاتے ہیں تو آفتاب سے زیادہ نور و حرارت جذب کرنے لگتے ہیں اور اس لئے وہ ستارہ زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کی روشنی کم معلوم ہونے لگتی ہو۔

لہسن کے فوائد

لہسن کا استعمال جس طرح اب کیا جاتا ہے، اسیطرح زمانۂ قدیم میں بھی پایا جاتا تھا۔ کیونکہ توریت سے بنی اسرائیل کا اس کو استعمال کرنا ثابت ہوتا ہو اور ہیرو ڈوٹس کہتا ہے کہ جب مصر میں ہرم اکبر بن رہا تھا تو مزدور لہسن کھاتے تھے۔ فرجیلیوس میں بھی درج ہے کہ یونانی اور رومانی سپاہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ بارہویں صدی کے ایک مصنف کا قول ہو کہ کھیتوں میں حرارت آفتاب سے بچنے کے لئے کاشتکار اس کو کھاتے ہیں۔ عرب کے اطبا اور فلاسفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۲۱ء میں جب شہر مرسیلیا میں وبا پھیلی اور بہت سے لوگ مرنے لگے تو قیدخانہ کے چار قیدیوں کو جنھیں پھانسی کی سزا دی جانے والی تھی حکم دیا گیا کہ وہ مردوں کو اٹھائیں لیکن ان پر وبا کا اثر نہیں ہوا حکومت نے اُن سے کہا کہ اگر وہ اس کا راز بتا دیں تو جان بخشی ہوجائیگی، چنانچہ انھوں نے کہا کہ وہ روزانہ لہسن کا ست استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال یہ قصہ صحیح ہو یا غلط لہسن میں بہت سے طبی فوائد مضمر ہیں۔ ابن رشد، ابن سینا، رازی، ابن بیطار وغیرہ نے لکھا ہو کہ اس سے بہت سے امراض کا علاج ہوسکتا ہے اور خود انھوں نے استسقا، سینہ کے امراض، دانت کا درد، گردہ کا سنگریزہ اس سے دور کیا۔ ویدک میں بعض قسم کے بخاروں کا علاج لہسن سے کیا جاتا ہے، مارگزیدہ کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہو اور شہد کے ساتھ ملاکر اس کا استعمال جلدی امراض کے لئے بھی مفید ہو۔ طب میں اس کا استعمال اس لئے کم کردیا گیا تھا کہ اس کی بو بہت خراب ہوتی ہو اور اس کی تیزی بعض خلایائے جسم کو نقصان پہونچاتی ہو۔ لیکن مسٹر کلمنٹ ایک کیمیاوی نے لسن کا تیل نکالا ہو اور یہ دونوں عیب اس کے دور کردیے ہیں۔ سات سال تک مسلسل اس کا استعمال کرنے کے بعد اس دوا کو اس نے پیش کیا ہو۔ اور اس کا نام اس نے یادل (yadil) رکھا ہو اس کے استعمال سے سل، انفلوئنزا، اسہال، صفائی زخم نزلہ اور امراض معدہ کو بہت فائدہ پہونچتا ہو۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہو کہ اس نے یادل کے استعمال سے انفلوئنزا کے ۸۰ بیماروں کا علاج کیا جنھیں سے ۸۰ دودن کے اندر اچھے ہوگئے۔